اصلاحی باتیں

احمد جاوید

نام کتاب : اصلاحی باتیں

مصنف : احمد جاوید

اہتمام : میاں غلام مرتضےٰ کھٹانہ

ناشر : مکتبہ جمال • لاہور

مطبع : تایا سنز پرنٹرز • لاہور

اشاعت : 2019ء

قیمت : 350 روپے

مکتبہ جمال

تیسری منزل حسن مارکیٹ • اردو بازار • لاہور

Cell: 0322-4786128 Ph: 042-37232731

mjamal09@gmail.com - www.maktabajamal.com

فہرست

بندگی اور استغفار

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وَحۡدَهٗ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَهٗ

آج کچھ تلخ باتیں کرنی ہیں کیونکہ میٹھی باتیں اب ہمیں سلانے کا کام کرتی ہیں، جاگنے کے لیے کڑوی باتوں کی ضرورت ہے۔ زندگی کچھ اصولوں کے تحت گزرتی ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں قومیں زندگی کی ترقی اور بقا کے لیے درکار مختلف طرح کے نظام بناتی ہیں بلکہ بناتی رہتی ہیں۔ جو قومیں اس میں ناکام رہ جاتی ہیں، یعنی اصولِ زندگی سے عملی نتائج پیدا کرنے کی اہلیت گنوا بیٹھتی ہیں، وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی پہچان ہی نہیں رہ جاتی اور وہ اپنی پہچان بھی غالب تہذیبوں اور قوموں سے مستعار لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ہم بھی زندگی میں ناکامی کی اسی سطح پر پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں اس گڑھے میں کسی نے دھکیلا نہیں ہے بلکہ ہم خود کودے ہیں۔ یہ ناکامی صرف تاریخی جبر نہیں ہے بلکہ ایک جرم ہے۔ وہ جرم یہ ہے کہ ہم دین اور زندگی میں کوئی نتیجہ خیز تعلق پیدا کرنے سے دانستہ گریزاں رہے اور گریزاں ہیں۔ اور یہ گریز کسی خاص قوم کا شعار نہیں ہے بلکہ پوری مسلم امہ اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔ دین کو محض ایک بانجھ تصور اور خیال بنائے رکھنا جس سے انتہائی رسمی، ظاہری، انفرادی اور محدود نتائج کے علاوہ کچھ نہ نکل رہا ہو تو ظاہر ہے کہ یہ جرم ہی کہلائے گا جس کا امت نے اجتماعی طور پر ارتکاب کیا

ہے۔ ہماری غفلت کی وجہ سے ہی آج یہ صورتِ حال ہے کہ انسانوں کی ذہن سازی کرنے اور مقاصدِ زندگی کا تعین کرنے والے تقریباً تمام علوم طالبِ علم سے خدا اور دین کو چھوڑنے یا ان سے لاتعلق رہنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ دین کو چھوڑے بغیر انسانوں کا مطالعہ کرنے والا علم حاصل نہیں ہوسکتا، اور اسی طرح دین سے منہ موڑے بغیر دنیا کو سمجھنے والے علوم میں مہارت نہیں پیدا کی جاسکتی۔ اس عالم گیر صورتِ حال میں ہم نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے کہ علم ہو یا عمل، اصول ہو یا نظام، اقدار ہوں یا ان کے مظاہر، یہ سب کچھ الف سے یے تک ہم اپنے غیروں سے اخذ کرنے پر مجبور بلکہ مائل ہیں، ہم ہر دروازے پر کشکول لیے کھڑے ہیں۔ آج کی دنیا اخلاقی، علمی، سیاسی، معاشی نظام بندی اور اقدار سازی کی جس سطح کو پہنچ چکی ہے، وہاں تک پہنچانے والی سیڑھی کے پہلے زینے سے آخری زینے تک کسی مسلمان کے قدم کے نشان نہیں ہیں۔ تو انسان کو اندر سے بنانے والی تمام قوتیں اور دنیا کو سمجھنے سمجھانے اور بنانے بگاڑنے والی ساری طاقتیں صرف غیر مسلموں کے پاس ہیں۔ ان کا چھوٹا سا حصہ بھی مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔ چلو دنیا میں کمزوری اور پسماندگی کی کوئی غلط صحیح تاویل ہوسکتی ہے لیکن اپنے دین کے ساتھ ہمارا جو رویہ ہے اس کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ ہمارا ایمان ایک جاہلانہ اسلوب میں ہے اور عمل ایک منافقانہ منہج پر۔ دین کو اپنی اختیار کردہ پستی میں کھینچ لانے کے جرم میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ خصوصاً دین سے نظام سازی کی روایت شروع کرنے والی فکر نے تصورِ دین میں اتنے بڑے بڑے خلا پیدا کر دیے ہیں کہ انہیں بھرنے کا کوئی طریقہ ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ دین کو نظام بنانے کا مشن لے کر اٹھنے والوں نے ایسی سطحیت اور اناڑی پن کا مظاہرہ کیا، اور دین کے نام پر ایسی ہٹ دھرمی اور سنگ دلی کو فروغ دیا کہ اب دین سے نظام سازی کی سنجیدہ کوشش کے بھی راستے ہم پر بند ہوتے جا رہے ہیں۔ غرض ہم نے دین کو ایک لفظ کی طرح تو مان رکھا ہے لیکن اس کے معانی سلب کر لیے

ہیں۔ ہم بس لفظ کو جھاڑ پونچھ رہے ہیں مگر اسے بولنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ ہم یہ بات جانتے تو ہیں مگر ماننے پر تیار نہیں کہ یہ دین مانا جائے گا تو صرف اپنی مراد پر مانا جائے گا، ہماری خواہش پر یا مجبوری اور اختیار پر نہیں۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ ہم کئی صدیوں سے زوال اور معدومیت کے نشیب میں لڑھکتے جا رہے ہیں۔ پہلے مسلم ریاست ختم ہوئی، پھر مسلم سوسائٹی کا قصہ تمام ہوا اور اب مسلم فرد کمیاب سے نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا تاریخ اور دنیا کی لوح سے اپنے مٹائے جانے کے یہ مراحل دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ اسی طرح معدوم ہوتے چلے جانا ہے یا موجود ہونے کی کوشش کرنی ہے۔ یہ دین اس لیے اترا تھا کہ اسے ساری انسانی صورتِ حال اور اس میں پیدا ہوتی رہنے والی تبدیلیوں کے ساتھ متعلق رکھا جائے، اور یہ تعلق غلبے اور نتیجہ خیزی کے ساتھ ہو۔ اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ غلبے کے ساتھ تعلق کا تو سوال ہی کیا ہے، اب اس تعلق کی معروف سطح کو بھی برقرار رکھنے میں مسلمان بری طرح ناکام ہیں۔ مسلمان اگر اپنے دین کے ساتھ ایک بڑے اجتماعی اسکیل پر سنجیدہ ہوتے تو آج تجربی علوم بھی ایمانی تاثیر کے حامل ہوتے اور معاشی و سیاسی عمل بھی روحانی سرگرمی کا حصہ ہوتا اور ایک بڑے اخلاقی کل کا جز ہوتا۔ مسلمانوں کا دنیا میں بڑا کردار یہی تھا کہ آخرت کی فلاح کو مقصود بنا کر ایک فلاحی دنیا تعمیر کریں، کیونکہ جنت کی طلب سچی ہو تو آدمی دنیا ہی کو جنت بنانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ تاکہ دنیا بھی ایک طرف تو راحت و سلامتی کا گھر بن جائے اور دوسری جانب اس سے کہیں بڑھ کر، اللہ کی حضوری سے بھر جائے۔ اللہ کی حضوری کے حوالے کے بغیر اور اللہ کی خوشنودی کا ریفرنس رکھے بغیر جنت کی کوئی حیثیت، کوئی وقعت نہیں ہے۔ اسی طرح دنیا کی خوش حالی کا ہر تصور تعلق باللہ میں مضبوطی کو مقصود بنا کر ہی قائم کیا جائے گا ورنہ تو دنیا کی ساری چمک دمک غفلت کے پردے پر بنے ہوئے رنگین نقش و نگار سے زیادہ کچھ نہیں۔ مسلمان کا کام تھا کہ اللہ پر ایمان کو اور اس کے ساتھ اخلاص و صداقت کے تعلق کو دنیاوی ترقی اور

خوش حالی کا بھی سبب بنا کر دکھاتا۔ اور اسلام کو دنیا کے لیے سب سے بڑی رحمت اور برکت کی حیثیت سے ثابت کرتا۔ اور سب قوموں کو یہ مشاہدہ کروا دیتا کہ دیکھو یہ دین انسان کی ذہنی اور اخلاقی تکمیل بھی کرتا ہے، انسانیت کی مجموعی سطح کو بھی بلند کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی دنیا اور اس کے حقائق کو بھی حالتِ انکشاف میں لانے کی مربوط، مضبوط اور مقصدی جد وجہد کرتا ہے۔ لیکن افسوس مسلمانوں نے اپنی اس ذمہ داری کا پاس نہ کیا۔ ان کی وجہ سے آج کی دنیا میں خدا کو نہ ماننا اور اسلام کو قبول نہ کرنا لگتا ہے کہ ایک قابلِ تسلیم عذر بن گیا ہے۔ آج ذہن کو ترقی دینے والی، شعور کی ساخت کو بہتر بنانے والی، اخلاقیات میں بامعنی اضافے کرنے والی، معیشت میں کوئی باقاعدہ نظام بن سکنے والی، سیاسیات میں ناگزیر حیثیت اختیار کر لینے والی کوئی ایک بات بھی کسی مسلمان کے منہ سے نہیں نکلی۔ بقولِ اقبال: مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے۔ اور یہ راکھ کا ڈھیر کہہ رہا ہے کہ مجھے آگ کا الاؤ مانو ورنہ میں تمہیں بھسم کر دوں گا۔ اب سوچیے کہ اس دھمکی پر لوگ ہنسیں گے یا ڈریں گے۔ نہایت سطحی باتیں نہایت سنجیدہ ہو کر کی جاتی ہیں، نہایت تیقن اور اعتماد سے کی جاتی ہیں۔ علم دین کا ہو یا دنیا کا، ذہنی سطح کو بلند ضرور کرتا ہے، ذہانت میں اضافہ ضرور کرتا ہے، ذہن کی ساخت میں بہتر تبدیلیاں ضرور لاتا ہے، ذہن کو productive ضرور بناتا ہے۔ کیا آج کی دینی تعلیم سے یہ فطری نتائج نکل رہے ہیں؟ ذہن کی بہتری کا ایک جنرل معیار ہے۔ غالب ذہن میں بہتر تھا اور اس کی اس بہتری کا اقرار فزکس جاننے والا بھی کرے گا۔ ہمارے دینی ذہن کی برتری کا اعتراف علم کے کسی بھی شعبے میں کیا جاتا ہے؟ یہ بہت سنگین صورتِ حال ہے کہ دین کی علمی ترجمانی کرنے والا ذہن معمولی ہو کر رہ جائے، احوالی نمائندگی کرنے والا قلب مرجھا کر رہ جائے اور اخلاقی مظہر بننے کی ذمہ داری ادا کرنے والا عمل دنیا پر کوئی چھوٹا سا اثر چھوڑنے میں بھی ناکام رہ جائے۔ آج ہم ایسے ہی بن کر رہ گئے ہیں، دوسروں کے دسترخوان پر بیٹھ کر

کھانے میں نقص نکالنے والے! بھائی، بہت فکر کریں۔ مسلم فرد کی تصویر بھی دھندلاتی جا رہی ہے۔ کوئی تیس چالیس برس پہلے تک یہ ماحول تھا کہ ہر گلی محلے میں دو چار آدمی ایسے ہوتے تھے جن کو دیکھ کر اپنی کمزوری اور بے عملی کے باوجود مسلمان ہونے پر فخر اور اعتماد محسوس ہوا کرتا تھا۔ مطلب، ایک روحانی گارڈین شپ تھی جو ہر ہر گلی میں جاری و ساری تھی۔ ہر محلے میں دین کا کوئی چلتا پھرتا مظہر مل جاتا تھا جسے دیکھ کر مجھ ایسے بے عمل کاہلوں میں بھی دین داری کی کشش پیدا ہو جاتی تھی۔ اس طرح کے دو چار آدمی پہلے ہر گلی میں ہوتے تھے، پھر یہ صورتِ حال گلی سے نکل کر محلے تک پہنچی، محلے سے نکل کر قصبے تک پہنچی اور اب قصبے سے نکل کر شہر میں آ رکی ہے۔ اب ہم خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ چلو میری گلی، میرے محلے، میرے قصبے میں نہ سہی، میرے شہر میں تو دو چار اللہ کے بندے موجود ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ کی یاد آ جاتی ہے۔ یہ معاملہ اب شہر سے نکل کر ملک تک جائے گا اور پھر یوں لگتا ہے کہ ہم یہ سوچ کر خوش ہوا کریں گے کہ ہمارے ملک میں نہ سہی، دنیا میں بہرحال اللہ کے دو چار دوست موجود ہیں۔

جب زوال آتا ہے تو قوم سب سے پہلے اپنی طاقت کے مراکز میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے۔ تہذیب ٹوٹتی ہے، اس کے بعد معاشرتی ادارے ٹوٹتے ہیں یعنی معاشرت انسانی نہیں رہ جاتی، ریاست ٹوٹتی ہے اور پھر بالآخر فرد مرض الموت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فرد کی آخری بیماری بہت طویل ہوتی ہے۔ ریاست اور معاشرے کے امراض تھوڑے ہی وقت میں موت پر منتج ہو جاتے ہیں لیکن فرد کو مرنے میں دیر لگتی ہے۔ اب احیاءِ اسلام اور تجدیدِ دین کا ہر کام فرد کو زندہ رکھنے یا کرنے کی کوشش سے شروع ہوگا۔ فرد کے احیا کا منصوبہ ایسا ہوتا ہے جس میں تہذیب کی تمام رہی سہی قوتیں شریک ہو سکتی ہیں اور اپنے حصے کا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ریاست و معاشرت کی تجدید میں تو بہت سی

pre-qualifications ہوتی ہیں جو سب لوگوں کو شامل نہیں ہونے دیتیں۔ تو آج یوں لگتا ہے کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ اپنے دین کے micro cosmic یعنی انفسی احیا کی ایک جذبۂ انقلاب کے ساتھ کوشش کرے۔ اس کوشش سے کوئی بھی معذور نہیں ہے۔ اس معاملے میں کسی کا عذر نہیں سنا جائے گا۔ یہ عذر تو مانا جا سکتا ہے کہ ریاست اور معاشرت غیر اسلامی ہے مگر میں کچھ کر نہیں سکتا۔ لیکن یہ بہانہ نہیں سنا جا سکتا کہ خود میرے اندر کی دنیا غیر دینی ہے مگر میں مجبور ہوں۔ اپنے زیرِ تصرف باطن کا نظام اگر اب بھی غیر دینی رکھا تو ڈر ہے کہ فردِ مسلم بھی غائب ہو جائے گا۔ تو بھائی، ہمیں اسی وقت کمر کس لینی چاہیے اور کام کا آغاز یہاں سے کرنا چاہیے کہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا امتی بنانا ہے۔ احیائے دین کا ہر کام یہیں سے شروع ہوتا رہا ہے، یہیں سے ہوگا۔ خود کو بدلو گے تو دنیا میں تبدیلی آئے گی۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہماری تبلیغی یا انقلابی تحریکوں میں، مدرسوں میں اور خانقاہوں میں ایک خزاں سی چھائی ہوئی ہے، ایک بے برکتی سی طاری ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ہم دین کے ترجمان تو بن بیٹھے، اس کا مظہر نہیں بنے۔ دین یقیناً اپنی ترجمانی بھی طلب کرتا ہے لیکن اپنا مظہر بننے کے بعد۔ اس ترتیب کو نظر انداز کیا تو خدانخواستہ دین کی ترجمانی کے لیے کرائے کے وکیل لانے پڑیں گے۔ لیکن تاریخ ہماری سپریم کورٹ نہیں ہے، یہاں کرائے کے وکیلوں سے مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا۔ تو خیر، سادہ سی بات ہے، میں خود اللہ کا بندہ ہوں، شخصیت کو چلانے والے پورے مکینزم میں بندگی کے اصول کو مؤثر رکھوں، عمل سے اسے نتیجہ خیز بناؤں اور خیالات سے اس کو تسلسل دوں۔ یہ ہے وہ ذمہ داری جس کی طرف مجھے ہر کام سے پہلے متوجہ ہونا ہے ورنہ تو سب مذاق ہے اور نفاق ہے۔ اپنے نفس پر اللہ کی حاکمیت نہیں ہے اور ہم چلے ہیں پاکستان پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنے! اور اللہ کا محکوم ہونے کی لازمی نشانی یہ ہے کہ بندہ چیزوں پر غالب آ جاتا ہے۔ اللہ کے محکوم ہونے کی اس سے بڑی نشانی کوئی

نہیں۔ یہ دوسری بات ہے جسے اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ نفس کو اللہ کی حکومت میں دینا سب سے بنیادی انقلابی عمل ہے۔ اللہ کا محکوم کسی بے دست و پا انفعالیت کا شکار نہیں ہوتا، یہ کوئی گوشہ گیر وجود نہیں ہوتا۔ اللہ کا محکوم اس حکم کو جس نے اس کو مسخر کر رکھا ہے، تسخیرِ دنیا کا سبب بھی بنا تا ہے۔ جس قوت سے بندہ خود کو اللہ کا محکوم بنا تا ہے وہی قوت دنیا کی تسخیر میں بھی درکار ہے۔ تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اندر کی دنیا اللہ والی ہو اور باہر کی دنیا اللہ سے خالی رہ جائے۔ اس لازمی ترتیب کو نظر انداز کرنے کے نتائج آج ہم بھگت رہے ہیں۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس کی ہوا بھی اللہ سے دور لے جاتی ہے۔ کم از کم مجھے تو اس بات پر کوئی شبہ نہیں ہے کہ جدید دنیا کی ایک ایک چیز اللہ سے دوری کا سامان ہے اور جدید زندگی اللہ سے لاتعلقی کا میدان ہے۔ اور ایسا ہونے میں ہماری مجرمانہ غفلت کا بہت ہاتھ ہے کہ آج دنیا میں انفرادی اور اجتماعی ترقی دین سے فاصلہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس دنیا میں ترقی اور خوش حالی کے جتنے اسباب ہیں وہ دین سے غیر مانوس کرنے اور دین کو اجنبی بنانے کا کام کرتے ہیں۔ تو بھائی، اس پورے نظامِ حیات کو اپنے اندر سے خارج کر کے اب اللہ کے لیے جینا سیکھو۔ میری پیاس بھی اللہ کے لیے ہے، میری کمزوری بھی اللہ کے لیے ہے، میری طاقت بھی اللہ کے لیے ہے۔ جدید زندگی نے اس عزمِ وجود کو توڑ دیا ہے اور آج مسلمانوں نے بھی اس زندگی کو قبول کر لیا ہے جسے اللہ سے منہ موڑے بغیر نہیں گزارا جا سکتا۔ ہم زہریلے پانی کی مچھلیاں بننے پر راضی ہیں اور اس سے نکلنے کی خواہش ہی نہیں رکھتے تو کوشش کیا کریں گے۔ لیکن بہرحال اس زہریلے تالاب سے نکلنا تو ہے۔ اور اس سے نکلنے کی کوشش ہمارے لیے ناگوار تو ہو سکتی ہے لیکن اس میں کوئی بڑی مشکل اور بڑا مجاہدہ نہیں ہے۔ کوئی بڑی قربانی اور بڑا ایثار بھی نہیں ہے جس سے ڈر کر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ سارا کام بس اتنا سا ہے کہ ہمارے ماتھے پر بندۂ دنیا لکھا ہوا ہے، اسے مٹا کر بندۂ خدا لکھوانا ہے اور پھر تھوڑی دیر بعد آئینے میں دیکھتے

رہنا ہے کہ بندۂ خدا کی عبارت مدہم تو نہیں پڑی۔ آپ سمجھ گئے ناں، صرف اپنے ذہن میں اپنی شناخت بدلنی ہے اور اس شناخت کو محفوظ رکھنا ہے، پھر ان شاء اللہ ایک عالم گیر انقلاب کی بنیاد پڑنی شروع ہو جائے گی۔ سرِ دست تو ہماری یہ حالت ہے کہ نماز کے وقت بھی اس ادراک کا غلبہ نہیں ہو پاتا کہ ہم بندۂ خدا ہیں۔ ہمیں اپنا افسر ہونا، ماتحت ہونا، تاجر ہونا، بیمار ہونا، صحت مند ہونا یہ سب رہ رہ کر محسوس ہوتا رہتا ہے مگر یہ بات کہ ہم سب سے پہلے اللہ کے بندے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہیں، اگر ذہن میں آتی بھی ہے تو بہت تکلف اور تصنع کے ساتھ۔ دنیا کا، اولاد کا یا خود اپنا خیال ذہن میں آجائے تو ہمارے متعلقہ احساسات بیدار ہو جاتے ہیں، لیکن دین کے ساتھ ہمارے احساسات کا کوئی بامعنی تعلق کم ہی رہ گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اللہ کی یاد آتے ہی اس سے وابستہ احساساتِ عبودیت اور جذباتِ بندگی ہمارے اندر بیدار ہو جائیں مگر ایسا ہو نہیں رہا۔ ہمارا پورا عرصۂ ہستی جو ہے وہ ۱۸ تاریخ یا ۱۹ تاریخ میں ہے، کہ ۱۸ کو یہ ہوا اور ۱۹ کو یہ ہونا ہے۔ یعنی ہمارا آج بھی محض ۲۴ گھنٹے کا ہے اور کل بھی۔

تو بھائی، اللہ کی بندگی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اپنے باہر کی دنیا کے ساتھ اور اپنے اندر کی دنیا کے سمیت۔ کم از کم یہ ارادہ تو کر ہی لینا چاہیے کہ ہمیں بس اللہ کا بندہ بن کر رہنا ہے اور اپنی تمام حیثیتوں کا تعین اسی بندگی سے کرنا ہے۔ آدمی کی ایک اصولی شناخت ہوتی ہے جس سے اس کی ذہنی شناختیں کنٹرول ہوتی ہیں، ایک دائرے میں آجاتی ہیں اور ایک فعال کل کے اجزا بن جاتی ہیں۔ تو بندگی ہی وہ اصولی اور کلی شناخت ہے جس میں میری تمام شناختیں گندھی ہوئی ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ گناہ سے بچو، پھر شبہے والی چیزوں سے بچو، پھر نیکی میں ترقی کرو۔ گناہ سے بچنے کے لیے اخلاص ضروری ہے اور نیکی میں آگے بڑھنے کے لیے محنت ضروری ہے۔ اخلاص

کا عملی ماڈل وفاداری ہے لیکن وفاداری کا تصور ہی اب بہت کم یاب ہوگیا ہے۔ گناہ سے وہی بچے گا جو صاحبِ اخلاص ہوگا، نیکی میں وہی ترقی کرے گا جو محنتی اور چست ہوگا۔ یہ مجرب بات عرض کر رہا ہوں کہ ڈپریشن وغیرہ سے بچنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنی نظر انداز شدہ قوتِ ارادی کو دریافت اور بحال کرے۔ ارادہ، یکسو ارادہ ایک ایسی قوت ہے جو ناکامیوں کے باوجود ڈپریشن سے محفوظ رکھتی ہے۔ ارادے میں یکسوئی ہو اور مراد تک پہنچنے میں مشکلات اور ناکامیاں پیش آئیں تو بھی انسان ڈپریشن سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ آدمی اپنے نفس کے تاریک حصوں کی لپیٹ میں آجائے اور اس کے اندر ایک گہری دھند چھا جائے تو یہ ڈپریشن ہے، جبکہ ارادہ سورج کی طرح ہوتا ہے جو تاریکی اور دھند کو غائب کر دیتا ہے۔ ڈپریشن سوچنے سے نہیں، کچھ کرنے سے ختم ہوتا ہے۔ گناہ سے بچنے کی ذمہ داری لینے والوں کو اس طرف سے خبردار رہنا چاہیے کہ بعض اوقات حالات اور تجربات کی وجہ سے آدمی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کئی گناہوں سے بچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر ڈر ہے کہ دل میں گناہ کی کراہت ہی باقی نہ رہ جائے۔ اس سے بچنے کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ گناہ کی دو بڑی بڑی قسمیں ہیں، ایک لغزش اور دوسری نافرمانی۔ لغزشوں سے مکمل بچاؤ ممکن نہیں ہے، جب تک ہم زندہ ہیں ہم سے لغزش ہوتی رہے گی۔ یہاں بس یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ لغزش عادت نہ بن بنے اور اس پر استغفار ضرور کیا جائے، اور اگر اس کا ازالہ کرنا، اس کا کفارہ دینا ضروری ہو تو اس میں دیر نہ کی جائے۔ عموماً لغزشیں غیر ارادی ہوتی ہیں لیکن اگر ارادہ شامل بھی ہو تو تلافی اور استغفار اسے جی کا روگ نہیں بننے دیتا اور آدمی کو مسلسل احساسِ جرم سے بچائے رکھتا ہے۔ لیکن نافرمانی میں ارادہ اور شعور پوری طرح شامل ہوتا ہے۔ نافرمانی کی بڑی نحوست یہ ہے کہ اللہ کا خیال بھی آجائے تو آدمی اسے ناگواری کے ساتھ ذہن سے جھٹک دیتا ہے۔ تو جب یہ کہا جاتا ہے کہ گناہ سے بچو تو اس میں بنیادی بات یہی ہوتی ہے کہ نافرمانی

سے بچو، اس نافرمانی سے جو جان بوجھ کر کی جاتی ہے اور جسے اپنی عادت بنالیا جاتا ہے۔
تو جناب، مختصر یہ کہ استغفار کرتے رہا کریں کیونکہ استغفار سے مناسبت پیدا کیے بغیر بندہ
گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ استغفار کوئی رسمی وظیفہ نہیں ہے، استغفار مومن کے لیے آہنگِ
حیات ہے، مزاجِ زندگی ہے۔

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْۢبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ
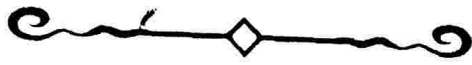
تزکیہ عیب جوئی نہیں ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

آج کی نشست کے باقاعدہ حاضرین میں سے ایک فاضل اور محقق دوست نے ایک خط بھیجا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ کچھ قیمتی مشورے بھی ہیں۔ اس خط میں ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ تزکیۂ نفس کی روایت میں دو مختلف المزاج طبقات پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جس میں اتباعِ شریعت کا ذوق اور قرآن وسنت سے مناسبت زیادہ ہے، یہ حضرات تزکیے کی ضرورت کو قرآن وسنت اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے پوری کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں رائے کے طور پر بھی وہ چیزیں اور تدبیریں قبول نہیں ہیں جو براہ راست شریعت سے اخذ نہ کی گئی ہوں۔ ان لوگوں کو تزکیۂ نفس کا کوئی ایسا تصور، کوئی ایسا معمول اور کوئی ایسا مقصود سرے سے قبول نہیں ہے جو قرآن وسنت کے نصوص سے نہ لیا گیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ حضرات پورا تصورِ انسان قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے لینا چاہتے ہیں اور کمالاتِ انسانی کی کسی ایسی تعبیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جو کتاب وسنت پر اساس نہ رکھتی ہو۔ اب دوسرا طبقہ وہ ہے جو یوں کہہ لیں کہ صوفیانہ مزاج رکھتا ہے۔ اصولی طور پر صوفیانہ مزاج ٹھیٹھ شرعی مزاج سے

ٹکراؤ نہیں رکھتا لیکن عمل کے دائرے میں آکر کچھ ایسی ضرورتیں ضرور پیدا ہوجاتی ہیں جو مذہبی مزاج رکھنے والوں کے لیے اجنبی ہوتی ہیں۔ پہلا طبقہ کیونکہ تاویل وغیرہ کا زیادہ قائل نہیں ہوتا، اس لیے وہ تزکیے کے متصوفانہ تصورات اور احوال ومظاہر کا ہمدردی اور گہرائی سے تجزیہ نہیں کرتا۔ یہ طبقہ اس بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتا کہ صوفیانہ مزاج یا منہج بھی پورے یقین سے اور ایمانی زور کے ساتھ مانتا ہے کہ تزکیے کی تمام حالتیں قرآن وسنت ہی سے پوری ہوتی ہیں اور تزکیے کے تمام مقاصد دین نے طے کر دیے ہیں۔ اسی طرح صوفیانہ مزاج رکھنے والے لوگ مذہبی مزاج والوں کے تصورِ تزکیہ کو سطحی اور مکینیکل سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ حضرات نہ تو حکم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور نہ ہی نفس کو ٹھیک طرح سے جانتے ہیں۔ ان دونوں طبقات کے اس ٹکراؤ اور دوری نے تزکیے کی روایت کو بھی خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ تاہم اصولی طور پر دونوں متفق ہیں کہ تزکیے کے مقاصد اور ذرائع کو کتاب وسنت سے ثابت ہونا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ اتفاق عمل کی دنیا میں برقرار نہیں رہ پاتا اور اس بے اتفاقی کی ذمہ داری دونوں ہی طبقوں پر ہے۔

تزکیے کی طرف پیشگی کشش اس عمل کو آسان بناتی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ یہ مقصودِ تزکیہ اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے لیے مقرر فرمایا ہے تو اس مقصود کی میرے اندر کشش پیدا ہوجاتی ہے اور اس کی قدر واہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ محض میرے ذہن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ اللہ نے مجھے اُس فطرت پر پیدا کیا ہے جس فطرت کی تکمیل کے لیے اور جسے عمل میں لانے کے واسطے اس مقصود کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور اس مقصود تک پہنچنے کی تمام صلاحیتیں اللہ نے میری خلقت میں رکھی ہیں اور اس تک رسائی کے سارے ذرائع کتاب وسنت میں فراہم ہوکر گویا میری تحویل میں دے دیے گئے ہیں۔ تو اب تزکیے کا عمل یہاں سے شروع ہوگا کہ ہم اپنے نفس کو جس اچھائی پر ڈھالنا چاہ رہے ہیں یا جس برائی سے بچانا چاہتے ہیں، اس اچھائی کا اچھائی ہونا اور اس

برائی کا برائی ہونا کتاب وسنت سے اچھی طرح ثابت ہے۔ مطلب، تزکیے کا پورا تصور، تمام مقاصد اور سب وسائل اور ذرائع دین سے فراہم ہوں گے، کہیں اور سے نہیں۔ اس پہلو سے وہ لوگ ایک مضبوط پوزیشن پر ہیں جو اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ تزکیے کے تمام راستے اور منزلیں کتاب وسنت میں بتا دی گئی ہیں، اور یہ دونوں ذخیرے ایسے ہیں جو تزکیۂ نفس کی تمام ضرورتیں حتماً، قطعاً اور مکمل طور پر پوری کرتے ہیں۔ تزکیے کے باب میں یہ مزاج رکھنے والا شخص دوسرے مزاجوں کے مقابلے میں جلدی کام یاب ہوتا ہے کیونکہ اس کے نفس اور اس کے تزکیے کی ساری صورتیں اور تمام مراحل قرآن وسنت کے روزِ روشن میں ہیں۔ یہ آدمی تزکیے کا عمل یقین سے شروع کرتا ہے اور یقین ہی سے راستے کو طے کرتا ہے۔ یہ ایسا خوش نصیب ہے جو اپنے اندر اور باہر دونوں دنیاؤں کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحتِ حکومت رکھتا ہے۔ یہ آدمی تزکیے کے صوفیانہ ذوق پر بھی ہوسکتا ہے اور اس سے لاتعلق بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ تصوف کا حامی بھی ہوسکتا ہے اور مخالف بھی۔ ہمیں اسی آدمی کی ضرورت ہے جو کسی تعبیری روایت کو، کسی ضمنی روایت کو اصلی اور مرکزی روایت پر غالب نہ آنے دے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ضمنی اور تعبیری روایت سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے اور اس سے دور بھی رہا جاسکتا ہے۔ تزکیے کو تصوف سے خاص کر لینے کے رویے سے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا ہے کہ ہمارا تصورِ انسان بندگی کی قرآنی فضا سے خارج ہوگیا ہے اور اللہ کے ساتھ تعلق کے احوال اور اسالیب بڑی حد تک بدل کر رہ گئے ہیں۔ ایک رومانوی آئڈیلزم نے انسان ہی کو نہیں خدا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور واقعی خدا اور واقعی انسان پر قانع رہنا مشکل ہوگیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا فی الوقت موقع ہے نہ ضرورت، مگر اتنا بہرحال کہنا ہے کہ تزکیے کے حوالے سے متصوفانہ اپروچ کی افادیت کا اقرار ضرور کرنا چاہیے البتہ اسے تزکیے کی شرطِ لازم بنا کر واجب ٹھہرا دینا خطرناک بات ہے۔ اسی طرح ایک بے لچک لٹرلزم (literalism) بھی

تزکیے کو بے روح عمل بنا دیتا ہے، اس پر بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ ایک خاص طرح کا شرعی اور قانونی مزاج رکھنے والا شخص تزکیے کے مسائل اور مقاصد کو محض الفاظ کی حد تک جانتا ہے اور نفس کی ماہیت اور بناوٹ، اس کی صلاحیتوں اور اس کی چالوں کا اتنا علم نہیں رکھتا جو مثلاً صوفیانہ مزاج والے کے پاس ہوتا ہے۔ اگر ان دونوں مزاجوں کے اختلاف کو ٹکراؤ اور تصادم کی وجہ بنائے بغیر اور کسی ایک کا انکار کیے بغیر ہم تزکیے کی روایت کو قرآن وسنت کی حتمی حاکمیت کے ساتھ آگے بڑھانے کے لائق ہو جائیں تو یوں سمجھیں کہ اپنی مراد کو پالیں گے۔ اس صورت میں ہم نفس کے بارے میں درکار علم بھی حاصل کرلیں گے اور مقاصدِ دین کی بہتر معرفت بھی اپنے اندر جذب کرلیں گے۔ مزاجوں کے اختلاف کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اگر ہم مقصدی ہو تو اس اختلاف کو تصادم میں بدلنے سے روکا ضرور جاسکتا ہے۔ اور ایسا ہی کرنا چاہیے۔ تو اگر ہم اپنے مزاج کو دیکھتے ہوئے اپنے تزکیے میں سنجیدہ اور مخلص ہو جائیں تو ان شاءاللہ ہر مزاج اپنی مراد کو پہنچ سکتا ہے۔ یعنی وہ مزاج بھی جو ایک عارفانہ اور عاشقانہ رنگ رکھتا ہے، اور وہ مزاج بھی جو ایک قانونی اور فقہی ذوق رکھتا ہے۔ یہ دونوں مزاج اپنے اختلاف کے باوجود تزکیے کے مشترک مقصود کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں بشرطیکہ آدمی خود کو اللہ کی مرضی اور حکم کے تابع کرنا اور رکھنا سیکھ جائے۔ تزکیہ کیا ہے؟ اپنے نفس کو، اپنے مزاج کو، اپنے ذہن کو، اپنی طبیعت کو اللہ کے حکم اور اللہ کی مرضی کے تابع رکھنے کا مسلسل اہتمام کرتے رہنا۔ جو آدمی اس میں جتنا کامیاب ہوتا چلا جائے گا اتنا ہی تزکیے میں کامیابی حاصل ہوتی رہے گی۔ تو بھائی، ہمیں اپنے نفس کو اللہ کے حکم اور مرضی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگشتِ ہدایت پکڑ کر سنوارنا ہے۔ بس یہی سارا تزکیہ ہے۔ تو ہمارے درمیان زندگی کا مقصود مشترک ہونا چاہیے، راستے اور وسائل مشترک ہونے چاہییں، منزلوں کا تعین مشترک ہونا چاہیے لیکن نفس پر اثرانداز ہونے والی تدابیر کو

اختیار کرنے کے معاملے میں ہم اور آپ الگ ہوسکتے ہیں۔ ممکن ہے کسی شخص کے لیے انفاق تزکیے کا ذریعہ بنے، کسی کے لیے کثرتِ نوافل زیادہ مؤثر ہو اور کسی نفس میں خدمتِ خلق سدھار کا وسیلہ بنے۔ تو یہ سب ذرائع ہمارے دین سے ثابت ہیں۔ مجھے جس ذریعے کی طرف زیادہ مناسبت ہو، اس مناسبت کو توڑنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ مسلمانوں میں کون ہے جو اس بات پر متفق نہ ہو کہ تزکیے کے لیے گناہ سے پرہیز، نیکی کی طرف لپکنا اور غفلت کے قریب نہ جانا ضروری ہے۔ کسی کو اس بات سے اختلاف نہیں ہوسکتا کہ ترکِ معصیت، ترکِ غفلت اور نیکی کی حرص تزکیے کی عمارت کو تھامنے والے تین ستون ہیں۔ اس اتفاق کے بعد ہمارے مزاج اور صلاحیت کا فرق رکاوٹ نہیں بنے گا۔ ہم اس فرق کو ختم یا کم کیے بغیر بھی ایک دوسرے کے لیے مفید اور معاون ہوسکتے ہیں۔ مجھے ضرورت ہے کہ مجھ کو احکام بتائے جائیں، آپ کو ضرورت ہے کہ ان احکام پر چلنے کے لیے دین کے فراہم کردہ وسائل بتائے جائیں، تیسرے آدمی کو ضرورت ہے کہ جس گھوڑے پر ہم سواری کرنے جارہے ہیں اس گھوڑے کے مزاج کو بھی سمجھ لے کہ یہ کب بدکتا ہے، کہاں گرتا، کدھر بھاگنے لگتا ہے۔ اب اسے بھی کوئی بتائے گا کہ نفس میں اتنی باریک چالیں ہوتی ہیں اور اس میں متاثر ہونے کی یہ یہ صلاحیتیں ہیں۔ تو اس طرح گویا ہم سب اختلافِ مزاج ہوتے ہوئے بھی ایک ہم مقصدی کے جذبے کے ساتھ آپس میں مفید اور کارآمد ہوسکتے ہیں۔ تو سمجھ رہے ہیں ناں یہ بات! یہ بات چونکہ عمل کرنے کروانے کی نیت سے کررہے ہیں اس لیے اسے پورا سمجھنا ضروری ہے۔ تزکیۂ نفس کے یہ تین معیارات ہیں جنہیں پیشِ نظر رکھنے سے یہ اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ میں اپنے نفس کو سدھارنے کی کوششوں میں ٹھیک سمت میں جارہا ہوں اور درست رفتار سے چل رہا ہوں۔ بس ہمیں یہ دیکھتے رہنا ہے کہ تزکیے کی سمت اللہ کی بتائی ہوئی ہو اور اس راستے پر چلنے کی رفتار ہمارے جذبۂ بندگی میں اضافے کی بدولت تیز سے تیز تر ہوتی رہے۔ رفتار

پر بھی نظر رکھنی ہے اور صحیح سمت کو بھی اوجھل نہیں ہونے دینا۔ میری سمت درست ہے یا غلط، میری رفتار درست ہے یا نہیں۔ اس کو جاننے کے لیے مجھے اپنے آپ کو ان کسوٹیوں پر پرکھنا ہوگا کہ گناہ سے بچنے میں کتنا کامیاب ہوں، غفلت سے آزادی کہاں تک میسر آئی ہے اور طبیعت میں نیکی کی طرف لپکنے والی حالت کس قدر پیدا ہوئی ہے۔ ان تینوں سوالوں سے اپنے آپ کو روزانہ جانچنا چاہیے۔ اس جانچ کے بغیر سونا بھی غلط ہے اور جاگنا بھی۔ اب اپنے اپنے مزاج کی رعایت اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق دین کے فراہم کردہ وسائل کو مضبوطی سے پکڑ کر اور دین ہی کے بخشے ہوئے مقاصد پر نظر گاڑ کر چلنا شروع کر دیں۔ تو یہ بات واضح ہے ناں کہ میرے مزاج اور میرے حالات کو تزکیے کے عمل میں اچھی طرح شریک رکھنے کے لیے مجھے دین ہی کے دیے ہوئے تنوع سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اس تنوع میں صوفیانہ مزاج بھی پوری طرح کھپ سکتا ہے اور غیر صوفیانہ طبیعت بھی فیض یاب ہوسکتی ہے۔

تزکیے کا ایک لازمی مطلوب یہ ہے کہ بندہ ذہنی، قلبی اور عملی کوشش کر کے نفس کو اس حالت میں لے آئے کہ وہ آدابِ بندگی سے مانوس ہو جائے اور احوالِ بندگی کا حامل بن جائے۔ یعنی نفس میں بندگی کا جوہر ابھارنے کے لیے جس طرح کے مستند اعمال درکار ہیں، وہ اعمال آدمی رغبت کے ساتھ انجام دینے لگے اور پھر ان اعمال کو درجۂ احسان تک پہنچانے کے لیے نفس کی جو کیفیت، حالت اور یکسوئی ہونی چاہیے، وہ بھی اسے حاصل ہو جائے۔ تزکیے کا مقصد یہ ہے کہ نفس اپنے اندر باہر سے بندگی کے سانچے میں ایسا ڈھل جائے کہ بندے کے اعمال، خیالات، احساسات اور احوال سطحِ احسان پر قائم ہو جائیں۔ نفس میں کسی خرابی کا ازالہ کرنا ہو یا اس کی کسی خوبی کو پروان چڑھانا ہو تو اس عمل میں اپنی صلاحیت، مزاج اور حالات کو نظر انداز نہ کریں بلکہ ان میں رہتے ہوئے دین سے استمداد کریں، سنت کو اپنا کفیل بنائیں تو ان شاءاللہ سب کچھ ٹھیک رخ پر اور

مناسب رفتار سے ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص دیکھتا ہے کہ اس کا نماز میں دھیان نہیں جمتا تو وہ اپنے اوپر جرمانہ بھی کرسکتا ہے، دھیان جمانے کی تدابیر بھی حفظ کرسکتا ہے، کثرتِ ذکر بھی اختیار کرسکتا ہے، تلاوت کا وقت بھی بڑھا سکتا ہے، کوئی فرحت پہنچانے والا معمول بھی اختیار کرسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اپنے مزاج اور استعداد اور حالات کی رعایت غیر مشروط نہیں ہے۔ بعض اوقات ان سے لڑنا پڑتا ہے اور انہیں چھوڑنا ہوتا ہے۔ باقی اس کی تفصیل ہر آدمی جانتا ہے کہ کب مزاج اور حالات کو کام میں لانا ہے اور کہاں ان کا انکار کرنا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوگئی، دوسری بات یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کے لیے سنجیدہ ہے اور تزکیۂ نفس کے لیے جو بھی مجاہدہ درکار ہے، اسے بھی انجام دینے پر کمر بستہ ہے، یعنی اس معاملے میں ہر محنت کے لیے تیار ہے کہ کسی طرح سے میرا نفس سدھر جائے اور اس کے اندر سے بگاڑ کی صورتیں ختم یا کم ہوتی چلی جائیں۔ تو ایسا آدمی جو نیت میں صادق ہے، عمل میں کاہل نہیں ہے اور خیال میں بھی یکسو ہے، اسے ایک کام سے بچنا چاہیے اور وہ کام ہے بہت باریک بینی کے ساتھ اپنی برائیاں ڈھونڈنا! خوردبین لے کر اپنی خامیاں اور برائیاں مت ڈھونڈا کرو، اس سے تزکیے کا عمل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجاتا ہے۔ مطلب، آپ جو نوالہ کھانے جارہے ہیں اُسے خوردبین سے دیکھ لیں تو واپس رکھ دیں گے، منہ میں نہیں ڈالیں گے۔ تو جو خوردبینی جائزہ آپ کے ہاتھ سے نوالہ گروا سکتا ہے، وہ نفس میں بے شمار خرابیاں دکھا کر اس کی اصلاح سے مایوس بھی کرسکتا ہے۔ تو بھائی، اللہ کی رحمت کا، اس کی شانِ مغفرت کا شکرگزاری کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے اور اس پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنی عیب جوئی سے بھی ایک حد کے بعد بچنا چاہیے۔ بس جو موٹی موٹی خرابیاں ہیں ان کے علاج پر توجہ مرتکز رکھیں اور نفس کے کونے کھدروں اور بالکل تاریک گوشوں میں پڑی ہوئی خرابیوں کو کھوجنے اور کریدنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ تو نفس کے پاس خرابیوں کی

ایک غیر محدود فہرست ہے جسے دیکھ کر آپ مایوس ہو جائیں گے۔ تو سیدھا طریقہ یہ ہے کہ میرے نفس میں ایسی خرابی جو میری بندگی کے مقاصد کو حاصل کرنے کے راستے میں یقینی رکاوٹ بنی ہوئی ہے، مجھے اسے دور کرنا ہے اور جاسوسی میں نہیں لگنا۔ تجسس دوسروں کا عیب ڈھونڈنے کے لیے بھی منع ہے اور بعض مواقع پر اپنی جاسوسی کے معنی میں بھی مضر ہے۔ کیونکہ اس سے نیکی نا قابلِ اعتبار ہو جائے گی اور برائی یقینی بن جائے گی۔ ہاں، بعض لوگوں کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ جو کام بھی کرتے ہیں، باریک بینی اور خوب کھوج کرید کے ساتھ کرتے ہیں۔ تو وہ اپنے اس مزاج کو کہیں اور استعمال کر لیں، اسے بے مہار عیب جوئی کا محرک نہ بنائیں۔ میرے اندر کئی عیب ہو سکتے ہیں جو میرے کردار پر اثر انداز نہیں ہو رہے، میرے اعمال کو متاثر نہیں کر رہے، میری نیت میں ملاوٹ نہیں کر رہے، تو انہیں بلا وجہ کرید کرید کر نکالنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ برائی کو ارتکاب کے قریب حالت میں دیکھ کر اس کا علاج کرنا چاہیے، محض صلاحیت یا میلان یا رغبت کی سطح پر پائی جانے والی خامیوں کی فہرست سازی نہیں کرنی چاہیے۔ گناہ کو چھوڑنے کے عزم، نیکی کی طرف لپکنے کی عادت اور اللہ کو یاد رکھنے کی قوت سے یہ مخفی اور معطل خرابیاں بھی ان شاء اللہ غائب ہوتی چلی جائیں گی۔

فرض کیا ایک آدمی ہے جو علمی، تحقیقی، دعوتی یا فلاحی کام کرتا ہے اور اپنی تعریف سن کر اسے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ صاحب اس کے احساس پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ احساس ان کے دل میں نہ پیدا ہوا کرے۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ اپنی تعریفیں سن کر خوش بھی ہوتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایک احساسِ جرم میں بھی مبتلا رہتے ہیں کہ اپنی ستائش پر خوش ہونا ایک بڑا اخلاقی عیب ہے جو میری جان نہیں چھوڑ رہا۔ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی ان بے چاروں کی حالت یہی رہتی ہے کہ دل میں خوشی اور احساسِ جرم کی متوازی لہریں چلتی رہتی ہیں، خوشی کی لہر میں کمی نہیں آتی اور احساسِ

جرم کی روانی ہے کہ مسلسل بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ یہ دونوں کے آگے بے بس ہیں۔ اب آپ خود سوچیے کہ ان کی یہ بے بسی انہیں نفسیاتی مریض کے علاوہ کیا بنائے گی؟ ایسے ہی ایک محترم کوئی دو چار برس پہلے مشورے کے لیے میرے پاس آئے تھے۔ نامور آدمی ہیں اور میں بھی ان سے خاصا واقف تھا۔ ان کا یہ مسئلہ سن کر مجھے عجیب سا لگا کیونکہ وہ علم وعمل میں مجھ سے بہت آگے ہیں۔ بڑی شرم آئی کہ ایسی عالم فاضل اور باعمل ہستی کو مجھ ایسا کم علم اور ناکارہ شخص بھلا کیا مشورہ دے سکتا ہے۔ لیکن ان کی اذیت اور پریشانی دیکھ کر میں نے ہمت کر لی اور ان سے عرض کیا کہ اپنی تعریف سن کر خوشی محسوس ہونا فطری بھی اور اخلاقی بھی۔ جو شخص لائقِ اعتبار لوگوں سے اپنی تعریف سن کر خوش نہیں ہوتا، ڈر ہے کہ وہ یا تو بے حس ہے یا پھر متکبر۔ بس اتنا دیکھ لینا چاہیے کہ اس خوشی میں عاجزی اور شکر گزاری واضح طور پر شامل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس میں گھبراہٹ اور فکرمندی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور تو اور، قرآن وحدیث کی خدمت کرنے والا عالم بھی اگر یہ خواہش رکھے کہ کوئی بڑا اور سمجھ دار آدمی اس کے کام کو سراہ دے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اسے بس اتنا دیکھ لینا چاہیے کہ اس پر ہونے والی تنقید کہیں اسے بری تو نہیں لگتی، وہ اصلاحی تنقید پر برا تو نہیں مانتا۔ یعنی تعریف کا اچھا لگنا تنقید کے برا نہ لگنے کے ساتھ ہو تو پھر یہ آدمی اچھا آدمی ہے۔ کوئی مجھے میری غلطی بتا دے یا اُس کی اصلاح کر دے تو مجھے اس تنقید اور اصلاح کو تشکر اور خوش دلی کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔ اگر یہ وصف مجھے نصیب ہے پھر میرے لیے روا ہے کہ اپنے کسی کام کی تعریف پر خوشی محسوس کروں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، اگر میرے دل میں یہ خواہش ہے کہ میرا کوئی بڑا یا کوئی سخن شناس شخص میری بات کو سراہے، تو یہ بات بھی ایک سادہ اور فطری چیز ہے، اسے نفس کے معائب اور نقائص میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔

دلی میں ایک استاد شاعر ہوا کرتے تھے، حیدر دہلوی۔ افسوس اب کم ہی لوگ ان

کے نام سے واقف ہیں۔ بہت قادر الکلام اور ماہرِ فن شاعر تھے۔ ان کا ایک شعر کسی زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا:

تنقید سے خفا نہ ستائش پسند ہوں
یہ دونوں پستیاں ہیں، میں ان سے بلند ہوں

شعر اچھا ہے مگر اس میں بننے والی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بس ایک غیر متوازن خود پسندی اور انانیت ہی برآمد ہوگی۔ تاہم پہلے مصرعے میں جو حال بیان ہوا ہے، وہ ایک بڑی شخصیت کا حال ہے۔ اسے تصوف میں فنائے نفس کے احوال میں شمار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ آدمی روحانی، نفسیاتی اور اخلاقی سطح پر بہت کامل آدمی ہے جو تنقید پر خفا ہوتا ہے نہ اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص تنقید پر خفا تو نہیں ہوتا البتہ تعریف اسے خوش ضرور کر دیتی ہے، تو وہ کسی ایسے کمال سے تو محروم ہوسکتا ہے جسے دین نے پسند تو کیا ہے مگر سب سے طلب نہیں کیا، یعنی سب کو اسے لازماً حاصل کرنے کا پابند نہیں بنایا۔ ایسے شخص کو کسی عیب اور نقص میں مبتلا گردانا درست نہ ہوگا اور خود اس شخص کو ایک متشکرانہ اور عاجزانہ طمانیت کی فضا میں رہنا چاہیے اور طبعی ستائش پسندی کو اپنا کوئی بڑا عیب جان کر اس پر کڑھتے رہنے کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ ہاں، اپنی تعریف کی خواہش رکھنے اور اس پر خوش ہونے کے کچھ قیود ضرور ہیں، ان کی بہر حال پابندی کرنی چاہیے۔ مثلاً کسی مفتی صاحب کو امام ابوحنیفہ بنا دیا جائے، کسی پیرِ طریقت کو جنیدِ بغدادی سے تشبیہ دے دی جائے، کسی شاعر کو میر و غالب کے برابر بٹھا دیا جائے تو اس وقت بھی اگر وہ مفتی یا صوفی یا شاعر اپنے دل میں خوشی محسوس کرتا ہے تو اس کا نفس یقیناً ایک بڑے بگاڑ میں مبتلا ہے۔ اس سے نیچے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کی تعریف کرنے والا اگر یہ اسلوب اختیار کرے کہ آپ فلاں سے بڑے ہیں، فلاں سے اچھے ہیں، تو اس پر بھی خوش

ہونا آپ کے نفس کی خرابی پر دلالت کرے گا۔ اور یہ فلاں چاہے آپ کا شاگرد اور برخوردار ہی کیوں نہ ہو، آپ کے اندر اس سے بڑا ہونے کی خواہش نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح اپنے شاگردوں وغیرہ کی مداحی پر بھی کان نہیں دھرنے چاہییں بلکہ نہیں اس کام سے روکنا ضروری ہے۔ جس تعریف پر خوشی محسوس کرنا اچھا ہے وہ اپنے بڑوں کی طرف سے ہوتی ہے اور زیادہ تر شاباش کی طرح ہوتی ہے۔ ایسی تعریف اور تحسین سے آپ کا چھوٹا ہونا آپ کے لیے مزید خوش گوار ہو جاتا ہے۔ تو مختصر یہ کہ اپنی تعریف پر خوش نہ ہونا یقیناً کاملین کا حال ہے لیکن بعض شرائط کے ساتھ خوش ہو جانے میں کمال کی نفی تو ہوتی ہے لیکن کسی عیب کا اثبات نہیں ہوتا۔ یہ تو مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایسے صاحبِ کمال ہی کہہ سکتے ہیں کہ 'بندے کو اپنے حق میں مدح وذم یکساں معلوم ہوتا ہے'۔

ہم ایک عرصے سے اخلاقی موضوعات پر بات کر رہے ہیں۔ آج کا موضوع بھی ایسا ہی تھا کہ عیب جوئی کا مزاج ترک کرو خواہ اس کا رخ دوسروں کی جانب ہو یا اپنی جانب۔ تجسس کا رویہ چھوڑو، چاہے دوسروں کے لیے ہو یا اپنے لیے۔ اس پر عمل کر کے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتنی سہولت اور فراخی کے ماحول میں ہمیں تزکیے کا مکلف کیا ہے۔ تزکیے کی پابندی کا ظہور اس کی شفقت اور رحمت سے ہوا ہے۔ ان شاء اللہ اس کا تجربہ ہو جائے گا۔ بس عیب جوئی نہ کرو، اپنے اندر بھی نہ کرو۔ اپنے اندر سے کرو گے تو خود سے تعلق ٹوٹ جائے گا اور دوسرے میں کرو گے تو اس سے رشتہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح نفس کی بلاوجہ تحقیر بھی نہ کیا کرو۔ نفس کو خیر کی طرف مائل کرنا چاہیے، اسے مسلسل حالتِ تحقیر میں رکھیں گے تو اس میں سرکشی پیدا ہو جائے گی۔ ترغیب اور تشویق سے زیادہ کام لو، یہ نفس کے لیے بڑے محرکاتِ خیر ہیں۔ اسے نیکی کا شوق دلاؤ اور شوق کے ساتھ ساتھ اسے اللہ سے ڈراؤ بھی۔ صرف تحقیر کرتے رہو گے تو ممکن ہے کہ

کچھ وقت کے لیے وہ تمہیں یہ دھوکا دے دے کہ تمہارے قابو میں آ گیا ہے، لیکن کسی بھی لمحے وہ اچانک ایسی سرکشی اختیار کرے گا کہ تم بے بس ہو جاؤ گے۔ اور ہاں اپنی عیب جوئی میں ایک پوشیدہ پہلو عجب اور خود پسندی کا بھی ہے۔ آدمی اپنے خفیہ معائب ونقائص کی تلاش میں نفس کی ایسی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی عادت ڈال لیتا ہے کہ خود پسندی کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ مطلب، جیسے تکبر اس جملے میں ہے کہ دیکھو یہ رہیں میری نیکیاں، ویسی ہی خود پسندی اس فقرے میں ہے کہ دیکھو یہ رہیں میری خرابیاں۔ دونوں میں ایک ہی خودنمائی کارفرما ہے۔ یعنی میں بالکل ٹھیک ہوں، یہ ایک ادّعا ہے، اور مجھے کوئی ٹھیک نہیں کرسکتا، یہ دوسری بڑھک ہے۔

توبہ اور ذکر کا ایک طریقہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ

قَالَ أَبُوهُرَيْرَةَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ:
((وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ
مَرَّةً)) رواہ البخاری

جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: 'اللہ کی قسم میں دن بھر میں ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جناب میں استغفار اور توبہ کرتا ہوں'۔ یہ حدیث بخاری شریف میں ہے۔

عَنْ أَبِي مُوسَى، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: ((إِنَّ
اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ النَّهَارِ،
وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ اللَّيْلِ، حَتّٰى تَطْلُعَ
الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا)) رواہ مسلم

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: 'اللہ تعالیٰ ہر رات اپنا دستِ رحمت پھیلاتا رہے گا کہ کوئی دن کا

گناہ گار توبہ کر لے، اسی طرح ہر دن بھی اس کا دستِ رحمت پھیلا رہے گا کہ کوئی رات کا گناہ گار تائب ہو جائے، یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے، یعنی قیامت آ جائے‘۔ یہ حدیث مسلم میں ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا، تَابَ اللهُ عَلَيْهِ)) رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے، یعنی قیامت آنے سے پہلے، جو بھی اللہ کے سامنے توبہ کرے گا اللہ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے‘۔ یہ حدیث بھی مسلم میں ہے۔

پہلے اس حدیثِ مبارکہ کے حوالے سے کچھ عرض کروں گا، اُس کے بعد ذکر پر جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اُسے آگے بڑھائیں گے۔ توبہ بہت بنیادی حالت، انتہائی بڑا ارادہ اور نہایت سنجیدہ اور نتیجہ خیز عمل ہے۔ یہ بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق میں درست جگہ پر رکھتی ہے۔ بندہ استغفار سے محروم رہ جائے، یا استغفار اس کا بہت مرکزی ذکر نہ بن پائے تو وہ تعلق باللہ کی ایک بڑی شرط پوری کرنے کے لائق نہ رہے گا۔ وہ درست پوزیشن جو توبہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اسے یکسوئی کا نام دیا جا سکتا ہے، اللہ کی طرف ہمہ جہت یکسوئی۔ یہ یکسوئی دین کے ہر طرح کے مطالبات کی اصل بھی ہے اور حاصل بھی۔ دین کا بنیادی ترین اور اصلی ترین تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی طرف یکسو رہو جذبۂ عبادت کے ساتھ، پورے ایمان کے ساتھ، دوامِ ذکر کے ساتھ، فرماں برداری کے عزم کے ساتھ اور مسلسل استعانت کے ساتھ۔ یعنی کامل اور صحیح ایمان کے ساتھ عبادت،

اطاعت اور استعانت کے زاویوں سے اللہ کی طرف منہ کیے رکھو، یہ اصلِ ایمان ہے، مبدءِ احوال ہے اور مدارِ اعمال ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ کے غیاب پر یکسور ہو اُس کے حضور میں رہتے ہوئے۔ توبہ چونکہ بندگی کی روح کے مانند ہے، اس لیے ایسی جامع اور ہمہ گیر یکسوئی کے قیام میں اس کا کردار مرکزی نوعیت کا ہے۔ توبہ کو بندگی کی روح اس لیے کہا کہ اس میں اللہ کا غیاب اور حضور، اللہ کا خوف اور محبت بالکل یکجان ہو جاتے ہیں۔ اور اس میں تکبر اور غفلت کے مکمل ازالے کی جو قوت ہے وہ تعلق باللہ کے شعور اور احساس میں کوئی خلل نہیں آنے دیتی۔ کبھی غور سے دیکھیں تو صاف دکھائی دے گا کہ استغفار میں دین کی مطلوبہ یکسوئی کے چاروں تناظر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ یعنی ایمان، عبادت، اطاعت اور استعانت، چاروں ہی توبہ کی تشکیل کے زندہ عناصر کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ ان معنوں میں بندگی کی روح، توبہ ہے۔ یہ گویا ایک سواری ہے جو اللہ کی خوشنودی، قرب اور مغفرت کے لامتناہی راستے پر برق رفتاری سے چلتی ہے۔ ہر توبہ کرنے والا اپنے تجربے سے جانتا ہے کہ توبہ خود کو نثار کرنے کے جذبے کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے آگے پھینک دینے کا عمل ہے جس میں کوئی ملاوٹ، کوئی ریا اور کوئی دکھاوا شامل نہیں ہوسکتا۔ توبہ کی اہمیت کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ استغفار، عمل اور حالت کے طور پر میسر نہ ہو، اور آدمی توبہ کو جوہرِ بندگی کی حیثیت سے اپنی عبادت اور ذکر میں محفوظ نہ رکھے تو اس کو اللہ کے ساتھ اخلاص نصیب نہیں ہوسکتا۔ توبہ میں بندگی کی حقیقت کا ادراک اور اللہ کی معرفت جمع ہیں۔ یہ ایک طرف تو مجھے میری حقیقت کو چکھا دیتی ہے اور دوسری طرف اللہ کی معرفت اور اس کے نفسی اور شعوری احوال میں رکھتی ہے۔ اگر خدانخواستہ میں توبہ کے زاویے سے اللہ کی طرف یکسوئی کا شعور اور حال نہیں رکھتا تو گویا میں اللہ کی بہت ہی ضروری شان سے جاہل رہ گیا، بے خبر رہ گیا، بے فیض رہ گیا اور لاتعلق رہ گیا۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ بندگی کی حقیقتِ مجسم یعنی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولِ ذکر میں غالب حصہ

استغفار کا ہوتا تھا، مقدار کے لحاظ سے بھی اور احوال کے اعتبار سے بھی۔ یعنی آپ ﷺ کے اذکار میں زیادہ کلمات استغفار کے ہوا کرتے تھے، اسی طرح جہاں جہاں آپ ﷺ اپنے جذبۂ عبودیت اور اپنی ضروریاتِ بندگی کا جو دعاؤں میں اظہار فرمایا کرتے تھے تو وہ کلمات استغفار کرنے والے بندے کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کی طرح ہوتے تھے۔ آنحضور ﷺ اپنے مالک ومعبود کو استعانت کے لیے، ستائش کے لیے، ثنا کے لیے پکارتے ہیں تو اس پکار میں حقیقتِ بندگی اور معرفتِ الٰہی انتہا پر پہنچ کر آپس میں مدغم ہو جاتی ہے، اور اُس پکار میں معنویت اور کیفیت کی مرکزی رَو استغفار کی ہوتی ہے۔ تو دیکھو رسول اللہ ﷺ نے اپنے عملِ پاک سے یہ دکھا دیا، یہ سکھا دیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ عبادت، استعانت غرض کسی طرح کا تعلق ہو، اُس میں معنی اور سچائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی جب تک اُس کی بنیاد توبہ پر نہ ہو۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور اور قرب کا ذوق اور حال نصیب ہی اتنا ہوگا جتنا کہ تم توبہ سے قلبی اور طبعی مناسبت پیدا کرو گے۔ مطلب یہ بالکل ایسی بات ہے کہ پورے تیقّن سے کہا جا سکتا ہے کہ بندہ اللہ کی حضوری کے احوال اسی قدر محسوس کر سکتا ہے جتنا کہ اس کے اندر توبہ کے احوال اور کیفیات ہیں۔ جس درجۂ انابت پر وہ ہے وہی درجۂ حضور اسے میسر ہوگا۔ اب اتنی بڑی چیز، اتنی بڑی دولت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسولِ مکرم ﷺ کے ذریعے سے ہمیں عطا فرمائی کہ یہ اللہ کے حضور کو میرے تخیل سے پاک رکھتی ہے، یہ اللہ کے تصور کو میرے واہمے سے پاک رکھتی ہے، یہ مجھے خدائے حقیقی کے حضور میں رکھتی ہے اور اسی طرح مجھے اپنی حقیقت، اپنی ناچیزی کے پورے احوال کے ساتھ رکھتی ہے کہ اللہ کے ساتھ تعلق کا یہ ادب ہے کہ خود کو پوری طرح اس پر منحصر رکھو، اس سے ڈرو، اسی سے امیدیں باندھو۔ یہ توبہ سکھا دیتی ہے۔ جس بدنصیب کو توبہ سے کرنٹ نہیں لگتا، جو توبہ کی حرارت محسوس نہیں کرتا، جس کی توبہ پر اس کے آنسو اور اس کے دل کی تڑپ گواہ نہیں ہے، اس کو اسلام کا کیا

پتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا کیا پتا، اسے بندگی کا کیا پتا، میں کہتا ہوں کہ اسے اللہ کا کیا پتا! وہ اللہ کو جانتا ہی نہیں ہے۔ توبہ جس کا دل نہ پگھلائے، جس کی آنکھیں نہ بہیں، توبہ کے جذبے سے جو اللہ پر نثار ہو جانے کا تجربہ نہیں رکھتا ہو، اس بچارے کو کیا معلوم کہ اللہ کیا ہے؟ اللہ سے تعلق کیا ہے؟

توبہ کے لیے کوئی لمبا چوڑا علم بھی درکار نہیں۔ اِس میں ذہن کا کردار ثانوی ہے۔ توبہ تو ایک وجودی پکار ہے، وجودی حال ہے، ایک پیاس ہے اور وہ پیاس لگتے ہی سیراب ہو جانے کا تجربہ ہے۔ یعنی توبہ ایسی پیاس ہے جو لگتے ہی سیراب ہو جاتی ہے۔ توبہ کے لیے گویا اپنے شعور میں خالص ہونا چاہیے، اپنے وجود میں سچا ہونا چاہیے، اپنے نفس میں مخلص ہونا چاہیے، اپنی فطرتِ بندگی سے حسی طور پر نزدیک ہونا چاہیے۔ تو بس توبہ چاہے ایک امامِ وقت کرے، چاہے مجھ ایسا جاہل آدمی کرے، ان دونوں کی توبہ باعتبارِ کیفیت ایک ہی ہوگی۔ مطلب یہ ایک عام ذریعۂ قرب ہے، ایک عام وسیلۂ تزکیہ ہے۔ یعنی توبہ کرتے ہی میرے اندر تزکیے کا سب سے یقینی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ توبہ کرتے ہی مجھے اللہ کے ساتھ تعلق میں جیسے رلا دینے والی، ہلا دینے والی سچائی نصیب ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ یہ سوئے ہوئے بندے کا عمل نہیں ہے، یہ جاگے ہوئے بندے کا حال ہے۔ جس نے توبہ کو دین کی بیداری نہ بنایا اس نے تو خواب میں دین قبول کیا، خواب میں دین پر چلا، خواب میں فوت ہو گیا اور کبھی آپ غور کیجیے کہ ہمارے دین میں تعبیرات کے ایسے ایسے چینلز کھول دیے گئے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق کے بعض ضروری آداب سے گویا بے خبر ہو گئے ہیں یا ان کو کم تر سمجھنے لگے ہیں۔ ان میں سے ایک توبہ ہے۔ بڑے بڑے مقصد بنا لیے، بڑی بڑی ریسرچ کر لی، بڑی بڑی تحریکوں کے اسٹرکچر کھڑے کر لیے اور یہ جو بیسک کوالیفکیشن ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات سے، اپنے پورے دائرۂ بندگی کے مرکز کے طور پر عمل میں لا

کر ہمیں دکھایا تھا، یہ گویا اعلیٰ درجے کا کوئی دینی عمل ہی نہیں رہا کہ اللہ کی جناب میں توبہ کر کے سویا کرو، توبہ کر کے جاگا کرو اور اس توبہ کو اپنے اللہ سے تعلق کی تزئین وآرائش اور تجدید و احیا کا مسلسل عمل بنائے رکھو تاکہ تمہارے تزکیے کا سامان بھی بغیر کسی بڑے مجاہدے کے ہوتا رہے، تاکہ تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لیے لازمی احساسات میسّر رہیں۔ کون ہے جو اس بات کو دل وجان سے نہ چاہتا ہو کہ میں اللہ کے ساتھ تعلق کے درست احساسات کے ساتھ زندہ رہوں، کون ہے جو یہ نہ چاہتا ہوگا۔ تو اگر ایسا چاہتے ہو اور چاہنے میں سچے ہو تو پھر توبہ کو اپنے قلب، اپنی زبان اور اپنے ذہن کا شعار بناؤ۔ توبہ ہمارا مادۂ وجود ہے، یعنی توبہ کے ذریعے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں قوتِ تخلیق دے دی ہے کہ اپنے آپ کو تخلیق کرتے رہو اپنی مرضی کے مطابق۔ تم توبہ کرتے جاؤ اور خود کو تخلیق کرتے رہو۔ تمہیں اتنا بڑا اعتماد اللہ نے اپنی طرف سے بخشا ہے کہ توبہ کا ہر عمل گویا اپنی تعمیرِ نو کا عمل ہے۔

اب صورتِ حال ایسی ہو چکی ہے کہ ہم توبہ کو جیسے اپنی توہین سمجھنے لگے ہیں، گویا توبہ کا عمل ہماری شان کے مطابق نہیں رہ گیا۔ عجیب طرح کی مذہبیت پھیل رہی ہے کہ توبہ کرنے سے بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔ کسی مذہبی شہرت والے سے کہہ کے دیکھ لو کہ توبہ کرلو تو وہ اسے اپنی توہین سمجھے گا۔ بھلا اس سے بڑھ کر کوئی اپنی تکریم ہو سکتی ہے کہ ہم کیچڑ میں لتھڑ کر اسے پکارتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں میں تمہیں زم زم سے زیادہ طیب پانی سے دھو ڈالتا ہوں۔ اس سے زیادہ تمہاری کوئی تکریم ہو سکتی ہے کہ اللہ توبہ کا قدردان ہے، وہ تمہارے گرنے کو بھی تمہارے اٹھنے کا اور تمہارا قد بڑھانے کا سبب بنا دیتا ہے۔ ہم گر بھی جائیں تو وہ ہمیں قدردانی کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ تو ہمیں بھی خدائے مہربان کی بہت قدر کرنی چاہیے۔ استغفار ہمیں یہ قدر سکھا دیتا ہے۔ توبہ وظائف وعملیات کی قبیل سے نہیں ہے، یہ تو گویا ہونے اور نہ ہونے کا ایک بامعنی اور مثبت تسلسل ہے۔

سچی توبہ ہمارے ہونے کی تکمیل کرتی ہے، اور وہ بھی خدائی ضمانت کے ساتھ۔ کبھی کر کے تو دیکھو! توبہ، اللہ کی طرف لپکنا ہے پوری کشش کے ساتھ، ساری قوت کے ساتھ۔ توبہ کرنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ میرا رب ناراض ہو گیا تو سب کچھ برباد ہے، اور وہ خوش ہو گیا تو سب کچھ اچھا ہے۔ اور میرے رب کی یہ شان ہے کہ وہ خوش ہونے اور اپنے کم زور بندوں کو معاف کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ بھلا سوچو کہ ایسے مالک ومعبود کی طرف اپنی غلطیوں کے انبار سمیت بھی تیز رفتاری کے ساتھ لپکنا ممکن ہے یا نہیں؟ اللہ ہم سب کو ایسی توبہ نصیب فرمائے کہ ہم دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ اُس کے حضور میں پکار سکیں کہ یا اللہ میں نے خود کو تجھ سے دور کر لیا، میری اس مہلک غلطی کو، یعنی تجھ سے دور ہو جانے کو بھی معاف کر دے، اور مجھے معاف کر کے، دوری کے اِس گناہِ عظیم کو بخش کر مجھے اپنا مقرب بنا لے۔ اب بتاؤ ایسی فرمائش اللہ کے سوا کسی سے کی جا سکتی ہے کہ دوری کا جرم معاف کر کے قرب کا انعام عطا فرما دے! خود ہی تصور کر لو کہ ایسی توبہ میں کتنا دل لگے گا، کیسی کشش محسوس ہوگی، اور عینِ قرب میں بندگی کا جوہر یعنی یکسوئی، عاجزی اور محتاجی کیسے کمال کے ساتھ پروان چڑھے گا۔ توبہ اللہ کی طرف کھینچنے والا مقناطیس ہے جس میں ایسی کشش ہے کہ بندہ پھر اپنی نیکیوں پر بھی توبہ کرنے کا ذوق پیدا کر لیتا ہے۔

جو تعلق رلاتا نہیں، ہنساتا نہیں، جگاتا نہیں، وہ کہاں کا تعلق ہے! تعلق کی سچائی پر یقین آ ہی نہیں سکتا جب تک ہم اس تعلق کے مشکل تقاضے نبھانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ اگر دوست کے لیے ہمیں تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور محنت نہ کرنی پڑے تو خود ہمیں اپنی دوستی پر یقین نہیں آتا، ماں باپ کی خدمت میں اگر مشقت نہ کی، راتوں کو نہ جاگے، ان کی ڈانٹ نہ سنی، ان کے ہاتھ پاؤں نہ دبائے اور انہیں آرام پہنچانے کے لیے خود کو نہ تھکایا تو ہمارے اندر وہ تسکین پیدا ہو ہی نہیں سکتی جس کی بنیاد پر ہمیں اطمینان ہو

جانتا ہے کہ ہم نے اپنے والدین کے ساتھ تعلق کا کوئی حق ادا کیا ہے۔ حالات مرضی کے
مطابق چل رہے ہوں تو تعلق کی سچائی کا تجربہ نہیں ہوتا۔ اس میں اطمینان ہوتا ہے ونے
سے محنت کرنے سے اور اپنی خواہشات کو خوشی کے ساتھ چھوڑ دینے سے۔ تعلق باللہ میں
بھی سچائی کی سب سے موثر دلیل یہی ہے کہ میں اللہ کی مرضی کے آگے اپنی ہر خواہش
بخوشی ترک کر دوں۔ خوشی اس کو نہیں کہتے کہ سب چیزیں میری خواہش کے مطابق ہیں۔
اس صورت حال میں تو آدمی اکتا جائے گا۔ خوشی یہ ہے کہ میرا دوست مجھ سے جو مانگتا
ہے، میں اسے دے دیتا ہوں اور کوئی پروا نہیں کرتا کہ میرے پاس کچھ رہ جائے گا یا
نہیں۔ ہمارے پاس سب سے قیمتی چیزیں ہماری خواہشات ہیں جن کی ہم بہت حفاظت
کرتے ہیں اور یہ ہمیں ساری زندگی دوڑائے پھرتی ہیں۔ ہمیں بندگی میں سچائی کی نعمت
عطا فرمانے کے لیے اللہ ہم سے ہماری خواہش طلب کرتا ہے۔ اپنی خواہشیں مجھے
دے دو، یعنی اپنی خواہشات کو میری مرضی اور میری پسند ناپسند کے مطابق بنا لو۔ جو اللہ کی
اس طلب کی تعمیل کرتا ہے وہی تعلق باللہ کی جنت میں رہنے کا تجربہ حاصل کر لیتا ہے، اور
جو اس میں بخل کرتا ہے وہ بے حمیتی اور بے وفائی کی دلدل میں دھنسا رہتا ہے۔ ع

ترک کامِ خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

(یعنی، میں نے اپنی خواہش چھوڑ دی تا کہ دوست کی رضا پوری ہو جائے)

یہاں دو شعر یاد آ رہے ہیں، ایک حافظ کا اور دوسرا نظیری کا۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

چو کحلِ بینشِ ما خاکِ آستانِ شماست
کجا رویم بفرما از این جناب کجا

یعنی جب ہماری آنکھوں کی بینائی، ہماری آنکھوں کا سرمہ ہی آپ کی چوکھٹ کی مٹی ہے، آپ کی چوکھٹ کی مٹی اگر آنکھوں میں نہ ڈالیں تو ہمیں کچھ سجھائی نہ دے، ہماری آنکھوں نے دیکھنا ہی اس مٹی کو سرمہ بنا کر سیکھا ہے۔ اب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ دفع ہو جاؤ! آپ کا یہ فرمان سر آنکھوں پر، ہم ہزار بار دفع ہونے کے لائق ہیں، لیکن بس اتنا بتا دیا جائے کہ ہم کہاں جائیں، کدھر کو جائیں۔ ہمیں کسی اور سمت کی بینائی آپ نے عطا ہی نہیں کی، اور ہمیں اس چوکھٹ کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا، تو ہم یہاں سے کہاں جائیں؟ استغفار کے وقت یہ شعر یاد آ جائے تو ان شاء اللہ توبہ میں روح دوڑ جائے گی۔ ایسا شعر ہے یہ۔ اسی طرح نظیری کا شعر بھی بے مثل ہے۔ نظیری، خواجہ حافظ کے پیرو تھے، ان ہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور فارسی کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

مرا بسادہ دلی ہاے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت اور مغفرت سے ہمیشہ پر امید رہنا چاہیے، اور یہ شعر اس امید کا انتہائی اظہار ہے۔ ذرا تصور کریں کہ قیامت کا دن ہے، گھبراہٹ کا دن ہے، ہول کا دن ہے، وہاں ایک بندہ اللہ کی جناب میں یہ شعر عرض کر رہا ہے۔ اے اللہ! مجھے میری بے وقوفی، سادہ لوحی اور حماقتوں کی وجہ سے بخشا جا سکتا ہے۔ یا اللہ! میں اتنا بھولا اور نادان ہوں کہ مجھے اس بے وقوفی ہی کی بدولت جنت میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ میں دنیا میں غلطیاں کر کے آیا ہوں اور یہاں یہ چاہ رہا ہوں کہ تو مجھے اُن غلطیوں پر شاباش دے۔ کیا کہنے، کیا کہنے، یہ موقع نہیں ہے اِن دونوں شعروں کی تشریح کا ورنہ یہ دکھانے کی کوشش کرتا کہ حافظ اور نظیری نے توبہ کو کس شان کے ساتھ تعلق باللہ کی اساس بنا کر دکھایا ہے۔ خیر۔

ایک بات اور بھی کرنی ہے، اور وہ طریقۂ ذکر کے متعلق ہے۔ اصول یہ ہے کہ جو چیز دل میں گھر نہیں بناتی، وہ ذہن میں بھی نہیں ٹک سکتی۔ ذہن میں وہی چیزیں جگہ بناتی ہیں جنہوں نے دل میں گھر کرلیا ہو۔ یہاں دل بہت زیادہ صوفیانہ اور عارفانہ معنی میں نہیں ہے بلکہ عام مفہوم میں ہے۔ یعنی ہمارے احساسات اور جذبات کا منبع۔ اسے طبیعت بھی کہا جاسکتا ہے لیکن طبیعت میں وہ بات نہیں ہے جو دل کہہ کر بلا تکلف سمجھ میں آجاتی ہے۔ تو بہرحال کہنا یہ ہے کہ اس سادہ سے اصول کے مطابق ذکر کرتے وقت یہ خیال رہنا چاہیے کہ ذکر کے الفاظ زبان اچھی طرح ادا کرے، ذہن اُس کے مفہوم کی طرف متوجہ رہے اور دل اس کی تاثیر کو محسوس کرے۔ ہم اللہ کی ثنا کریں تو اس طرح کہ اُس ثنا میں میری زبان اطمینان کے ساتھ مشغول ہے، ذہن اس کے مفہوم سے روشن ہے اور دل اس کی کیفیت میں غرق ہے ایک جذب کے ساتھ، ایک فخر کے ساتھ۔ ان تینوں میں سے ایک بھی ذکر کے عمل سے لاتعلق رہ جائے تو ذکر میں کوئی بنیادی کم زوری ضرور رہ جاتی ہے۔ تو کوشش کریں کہ ذکر میں دل کو شریکِ غالب کی حیثیت سے مشغول رکھا جائے۔ اس سے ایک تو ذکر میں گہرائی، سچائی اور تاثیر بڑھ جائے گی اور دوسرے اللہ کی حضوری میں ہونے کا احساس نصیب ہوجائے گا۔ یہ کوئی لمبا کام نہیں ہے، بالکل آسان اور مختصر سا ہے۔ ہم لوگ ہر نماز کے بعد تسبیحِ فاطمی تو پڑھتے ہی ہیں، اسی تسبیح کو اس اہتمام کے ساتھ پڑھ لیا کریں۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا دائرہ پھیلاتے جائیں یہاں تک کہ دعا، نماز، تلاوت وغیرہ بھی اسی طریقے سے ہونے لگے۔ ان شاء اللہ حضور اور احسان کی حالت ایک شانِ دوام کے ساتھ حاصل ہوسکتی ہے۔

آپ خود سوچیے کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اللہ کو یاد کروں اور دل غافل رہ جائے، میں اللہ کا کلام پڑھوں اور اس کی حلاوت زبان کو محسوس نہ ہو، اس کی روشنی ذہن کو جگمگا نہ دے اور اس کی حرارت دل کو زندہ نہ کردے! یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

دل کو کھنڈر بنا کر ذکر کی عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ سب چیزوں میں گہرائی دل کی شمولیت سے پیدا ہوتی ہے۔ بندگی کے کسی عمل وغیرہ میں دل کو غافل اور غیر حاضر نہیں رہنے دینا چاہیے۔ ان لوگوں میں شامل ہونے سے بچنا چاہیے جو نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو انگڑائیاں اور جماہیاں لیتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ ان کی مذمت خود اللہ نے فرمائی ہے، یعنی کسل کو اللہ نے برا کہا ہے۔ اسی لیے کسل گویا دین داری کی خودکشی ہے۔ کسل کہتے ہی ہیں عبادت سے دل کے غیر متعلق ہو جانے کو۔ دل حاضر ہو تو کہاں کا کسل۔ کسل تو سمجھتے ہیں آپ؟ جی ہاں، کاہلی جس میں تھوڑی سی بیزاری بھی شامل ہو۔ اللہ نے چاہا تو کسی وقت دل پر ذرا گہرائی میں جا کر بات کریں گے۔ ایمانی تناظر ذہن سے زیادہ دل میں قائم ہوتا ہے، اور اس پر بعض صوفیا کا کلام ایسا ہے جس سے علما کو بھی مستفید ہونا چاہیے۔

محترم نیاز صاحب نے پوچھا ہے کہ نفس پر شیطان کس طرح حاکم ہو جاتا ہے؟ اس کا ایک سہل سا جواب یہ ہے کہ نفس میں تقوی کے ساتھ فجور بھی الہام کیا گیا ہے، تو نفس کا وہ حصہ جس میں فجور الہام کیا گیا ہے، وہ شیطان کی شکارگاہ ہے۔ یہ بات نفس کی بناوٹ میں داخل ہے کہ یہ گناہ کی طرف راغب ہوتا ہے، گناہ کی طرف اسی خِلقی رغبت کی وجہ سے غفلت کے لمحات میں شیطان اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ تو اب اس میں تین بنیادی چیزیں ہیں، یعنی نفس کی وہ تین کمزوریاں جو شیطان کو غالب آنے کی دعوت دیتی ہیں، یہ ہیں: غفلت، لذت پرستی اور سرکشی۔ ان تین کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نفس پر تسلط حاصل کر لیتا ہے اور اس کے مادۂ تقوی کو معطل کر دیتا ہے بلکہ نفس کو تقوی سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہ شیطان کا بڑا کاری وار ہے، بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس حملے سے اپنی حفاظت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کسی ایسے حال اور کیفیت کو قبول نہ کرے جو اللہ کی خشیت سے مناسبت نہ رکھتی ہو یا جس کیفیت کے نتیجے میں اللہ کا خوف برقرار نہ رہتا ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ شکرگزاری، احسان مندی اور شدید محبت کی کیفیات

دل کو کلانڈر بنا کر ذکر کی عمارت قائم نہیں ہو پاتی۔ سب چیزوں میں گہرائی دل کی شمولیت سے پیدا ہوتی ہے۔ بندگی کے کسی عمل وغیرہ میں دل کو غافل اور غیر حاضر نہیں رہنے دینا چاہیے۔ ان لوگوں میں شامل ہونے سے بچنا چاہیے جو نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو انگڑائیاں اور جماہیاں لیتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ ان کی مذمت خود اللہ نے فرمائی ہے، یعنی کسل کو اللہ نے برا کہا ہے۔ اسی لیے کسل گویا دین داری کی خودکشی ہے۔ کسل کہتے ہی ہیں عبادت سے دل کے غیر متعلق ہو جانے کو۔ دل حاضر ہو تو کہاں کا کسل۔ کسل تو سمجھتے ہیں آپ؟ جی ہاں، کاہلی جس میں تھوڑی سی بیزاری بھی شامل ہو۔ اللہ نے چاہا تو کسی وقت دل پر ذرا گہرائی میں جا کر بات کریں گے۔ ایمانی تناظر ذہن سے زیادہ دل میں قائم ہوتا ہے، اور اس پر بعض صوفیا کا کلام ایسا ہے جس سے علما کو بھی مستفید ہونا چاہیے۔

محترم نیاز صاحب نے پوچھا ہے کہ نفس پر شیطان کس طرح حاکم ہو جاتا ہے؟ اس کا ایک سہل سا جواب یہ ہے کہ نفس میں تقوی کے ساتھ فجور بھی الہام کیا گیا ہے، تو نفس کا وہ حصہ جس میں فجور الہام کیا گیا ہے، وہ شیطان کی شکارگاہ ہے۔ یہ بات نفس کی بناوٹ میں داخل ہے کہ یہ گناہ کی طرف راغب ہوتا ہے، گناہ کی طرف اسی خِلقی رغبت کی وجہ سے غفلت کے لمحات میں شیطان اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ تو اب اس میں تین بنیادی چیزیں ہیں، یعنی نفس کی وہ تین کمزوریاں جو شیطان کو غالب آنے کی دعوت دیتی ہیں، یہ ہیں: غفلت، لذت پرستی اور سرکشی۔ ان تین کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نفس پر تسلط حاصل کر لیتا ہے اور اس کے مادۂ تقوی کو معطل کر دیتا ہے بلکہ نفس کو تقوی سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہ شیطان کا بڑا کاری وار ہے، بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس حملے سے اپنی حفاظت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کسی ایسے حال اور کیفیت کو قبول نہ کرے جو اللہ کی خشیت سے مناسبت نہ رکھتی ہو یا جس کیفیت کے نتیجے میں اللہ کا خوف برقرار نہ رہتا ہو۔ اللہ تبارک وتعالی کے ساتھ شکر گزاری، احسان مندی اور شدید محبت کی کیفیات

میں بھی اس کا خوف ایک مرکزی حال کی طرح شامل ہوتا ہے۔ اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ جو کیفیت اللہ سے ڈرنے کو ناگوار یا مشکل یا مصنوعی بنا دے، اس سے یہ سوچ کر بھاگنا چاہیے کہ وہ کیفیت یقیناً شیطان کی طرف سے ہے۔ اللہ کا خوف تو دل کو سرشار رکھتا ہے! یہ فقرہ بامعنی ہو جائے تو نفس درست حال پر ہے اور اسے گناہ کے اثرات سے بچنے کی خدائی توفیق حاصل ہے۔ ہمیں اگر اپنی حفاظت کرنی ہے تو اپنے نفس کو دو مقاصد کا پابند رکھنے بلکہ اسے ان مقاصد سے مانوس کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ غفلت سے بچنا ہے اور معصیت سے بچنا ہے۔ تو غفلت سے بچنے کا سامان ذکر سے کرو اور گناہ سے حفاظت کا بندوبست مجاہدے سے۔ یاد رکھنا، گناہ سے بچنے میں جو لذت ہے وہ نیکی کرنے میں بھی نہیں ہے۔ گناہ سے بچنے میں کامیابی سے دل کو ایک غیبی شاباش ملتی ہے کہ ہاں تو اللہ کا وفادار ہے، تجھے اللہ سے محبت ہے جب ہی تو اس سے ڈرتا ہے۔

جمعۃ المبارک، 21 اپریل 2017
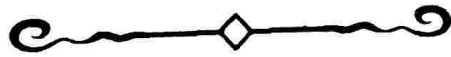
سخاوت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ وَ صَلِّ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسُلِّطَ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا))

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

رشک دو ہی طرح کے آدمیوں سے کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور اسے یہ توفیق دی کہ وہ اللہ کی راہ میں وہ مال لٹائے اور دوسرا وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا کی اور وہ اس کے ذریعے سے درست فیصلے کرتا ہے اور لوگوں میں اسے پھیلاتا ہے۔ (متفق علیہ)

قَالَ عَبْدُ اللہِ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((أَیُّکُمْ مَالُ وَارِثِہِ أَحَبُّ إِلَیْہِ مِنْ مَالِہِ؟)) قَالُوا: یَا رَسُولَ اللہِ، مَا مِنَّا أَحَدٌ إِلَّا مَالُہُ أَحَبُّ إِلَیْہِ، قَالَ: ((فَإِنَّ مَالَہُ مَا قَدَّمَ، وَمَالُ وَارِثِہِ مَا أَخَّرَ))

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم میں سے ایسا کون ہے جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال محبوب ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہم میں تو ایسا ایک بھی نہیں، ہر ایک کو اپنا ہی مال محبوب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا مال تو وہی تھا جو اس نے آگے بھیج دیا۔ (بخاری)

یعنی نیک کاموں میں خرچ کر کے ذخیرۂ آخرت بنا لیا، اب پیچھے رہ جانے والا مال تو اس کے وارثوں کا ہے۔

سَمِعْتُ عَدِیَّ بْنَ حَاتِمٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُولُ: ((اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ))

جناب عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے سے ہی ہو۔ (متفق علیہ)

سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللہِ، قَالَ: ((مَا سُئِلَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَطُّ فَقَالَ لَا))

جناب جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی کچھ نہیں مانگا گیا جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 'نہیں' فرمایا ہو۔ (متفق علیہ)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ، إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَيَقُولُ الْآخَرُ: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا))

جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ صبح جب اللہ کے بندے بیدار ہوتے ہیں، دو فرشتے آسمان سے نازل ہو کر یہ دعا نہ کرتے ہوں، ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ، خرچ کرنے والے سخی کو اچھا بدلہ عطا فرما، دوسرا کہتا ہے: اے اللہ، جوڑ جوڑ کر رکھنے والے بخیل کو تباہ کر۔ (متفق علیہ)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ: ((تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ))

جناب عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام میں کون سی خوبیاں بہتر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھلانا اور واقف و ناواقف ہر ایک کو سلام کرنا۔ (متفق علیہ)

شعبان تقریباً آدھا گزر گیا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس مہینے کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں رمضان کی تیاری کی جاتی ہے۔ رمضان کو اگر ایک گھر تصور کریں تو شعبان اس کی دہلیز ہے، اس کا دالان ہے۔ جس نے شعبان کو اچھا بنا لیا، اس کا رمضان بھی اچھا ہو جاتا ہے۔ اس مہینے کے شروع ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رمضان اپنی ساری برکتوں کے ساتھ ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ تو خوب یکسوئی کے ساتھ، شوق کے ساتھ اور قدرے محنت کے ساتھ ایسے معمولات اختیار کرنے چاہییں جو رمضان کے روزوں اور دیگر عبادات و معمولات کو آسان بنانے اور مقبول بنانے میں کام آئیں۔ جیسے آج جو روایتیں پڑھیں ہیں ان میں سے کچھ سخاوت اور فیاضی کے متعلق ہیں۔ مثلاً دوسری روایت میں سخاوت کے لیے جو مزاج درکار ہے یا فیاضی کے لیے جو سب سے بڑا سبب چاہیے، وہ بھی ارشاد فرما دیا گیا۔ وہ جو روایت ہم نے اس مفہوم میں پڑھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارثوں کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ تو سب کی طرف سے جواب آیا کہ ہم میں سے تو کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا مال تو وہی ہے جو آخرت میں نیک اعمال کی صورت میں ذخیرہ ہو چکا، باقی جو کچھ فی الحال تمہارے ہاتھ میں ہے، یہ تو تمہارے وارثوں کا مال ہے۔ اس حدیث کی تھوڑی سی تشریح ضرور ہونی چاہیے لیکن اس سے پہلے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شان بتانی ہے جو اس واقعے سے ظاہر ہے۔ وہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے مزاج شناس تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت رسانی کی غرض سے کچھ پوچھتے تھے تو ان حضرات کا متفقہ جواب وہی ہوا کرتا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلوب ہوا کرتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق کے منتہا پر پہنچ جانے میں ایک تو وہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس ہو گئے تھے اور دوسرے ہدایت رسانی کے نبوی نظام کے حرکیات اور مقاصد کا وجدانی شعور بھی

رکھتے تھے۔ آپ ذرا تصور کیجیے کہ یہ سوال ہم میں سے چار پانچ لوگوں کے سامنے رکھا جاتا تو ان چار پانچ کا جواب کبھی ایک نہ ہوتا۔ کچھ ہاں کہتے اور کچھ نہیں۔ ہم ایسے لوگ یہ سمجھتے کہ یہ استفسار اس لیے کیا جارہا ہے کہ صحیح جواب دینے والے کو شاباش دی جائے۔ ہم میں سے شاید کوئی یہ سمجھنے کے قابل نہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بات ہدایت رسانی کی غرض سے پوچھی ہے، شاباش دینے کے لیے نہیں۔ لیکن وہ صحابہ تھے، ہدایت کے انفسی اور آفاقی نظام کے کل پرزے! ان کا ذوقِ تعلق انہیں مرادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر رکھتا تھا اور وہ ہر ارشادِ رسالت علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم کے سبب اور غایت تک پہنچا دیتا تھا۔ وہ خود کو مٹانے کی نظر سے دیکھتے تھے، کچھ بننے بنانے کی نگاہ سے نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس اور پیغامِ مبارک کے آگے فنائیت کے اس اٹل موقف اور مستقل حال پر رہنا صحابہ کا وہ امتیاز ہے جس میں کوئی فرد اور کوئی طبقہ ان کا شریک نہیں۔ وہ اپنے ذہن اور وجود کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ اپنی واحد تعریف کے طور پر محض عباد اللہ اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے، ایسی طمانیت کے ساتھ جو فخر سے پاک تھی۔ ہم ہوتے تو یہ سمجھتے کہ وارثوں کے مال کو زیادہ محبوب بتانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خوش ہو جائیں گے، کیونکہ اس میں ایک ایثار کا پہلو ہے کہ آدمی مکان خود بنائے اور تختی بیٹے کے نام کی لگوا دے۔ پھر چاہے ہماری پسند ناپسند جو بھی ہوتی ہم اپنی خودنمائی کے جذبے سے پیدا ہونے والی نادانی میں یہ کہہ دیتے کہ حضور! ہمیں تو اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہے۔ صحابہ کا یہ مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ سوال کوئی تفتیش نہیں تھا، ایک بہت بڑے جواب کی تمہید تھا۔ وہ بھلا اس اسکیم آف تھنگز میں کیوں مزاحم ہوتے۔ اس سوال جواب کی یہ تعبیر غالباً درست نہ ہوگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ جانتے تھے کہ آدمی کو فطرتاً اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ صحابہ چونکہ سچے تھے اس لیے انہوں نے اس فطری بات کی

تصدیق کر دی۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کو اپنا مال اس لیے محبوب ہوتا ہے کہ وہ ان کی اولاد کو ملے گا۔ اولاد کی محبت مال کی محبت پر غالب ہوتی ہے اور ایسا نہ ہو تو اسے فطرت کا بگاڑ سمجھا جاتا ہے۔ ہاں یہ الگ بات کہ وارث اولاد نہ ہو، کوئی اور رشتے دار ہو۔ اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ اپنا مال وارثوں کے مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اب یہاں سے ہم اس حدیث کو ذرا گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو سخاوت کے باب میں رکھا ہے۔ امام صاحب کے اس عمل سے حدیث کو سمجھنے کا راستا کھل جاتا ہے۔ اللہ اکبر! ہمارے سلف دین کی صورت اور حقیقت دونوں کو جامع تھے، کیا کہنے۔ ذرا خود سوچیے کہ مال کے محبوب ہونے کے بیان کو سخاوت کے باب میں رکھا جا رہا ہے! ایسا کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ دین اور مقاصدِ دین کا گہرا فہم اور ذوق درکار تھا۔ تو اس رخ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوچھا جا رہا تھا کہ آپ لوگوں کو یہ زیادہ پسند ہے کہ آپ کا مال ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے یا پھر یہ پسند ہے کہ وہ آپ کے ہاتھ سے نکل کر وارثوں کا ہو جائے؟ اب صحابہ کا جواب گویا فطرتِ خیر کے منہ سے نکلا ہوا جواب ہے۔ ظاہر ہے مال ہمارا رہے گا تو اولاد کے کام بھی آتا رہے گا، وارثوں پر بھی اس سے استفادے کا راستا کھلا رہے گا۔ یہ تو ہوا ایک پہلو، اس روایت کی ایک دوسری جہت بھی ہے جسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے۔ ہمیشگی کا یہ تصور اور یہ خواہش کسی بھی محبت کا لازمی تقاضا ہے۔ محبوب کوئی بھی ہو، محبت کرنے والا اس کے دوام اور ضمناً اپنی بقا کا آرزومند ہوتا ہے۔ دنیاوی مال کی محبت بھی طبعی ہے، اس کی افادیت بھی مسلّم ہے لیکن اس میں بڑا مسئلہ یہ ہے کہ محبوب فانی بھی ہے اور ہرجائی بھی۔ یہ دو چیزیں عاشق کو انتباہ کرتی ہیں کہ محبت کو تو باقی رکھو مگر محبوب بدل لو۔ ایسی محبت کا کیا حاصل حصول جس میں محبوب عارضی ہو

اور محبت دائمی۔ تو آپ سمجھ گئے نا کہ اس حدیث میں محبوب کو بدلنے کے اسباب عطا فرمائے گئے ہیں اور دائمی محبت کو دائمی محبوب فراہم کیا گیا ہے۔ یہاں صحابہ رضی اللہ عنہم نے تبدیلیِ محبوب کے اس مشن کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کے عین مطابق نفس اور دنیا کے تعلق کی اس سطح کے اظہار کا ذریعہ بننا قبول کیا ہے جس سطح کو بدلنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلوب تھا۔ اب دیکھیں تو اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے مال سے محبت کرو، ضرور کرو، اپنے مال میں اضافہ کرو، ضرور کرو مگر اس مال سے اور اس مال میں جو ہمیشگی رکھتا ہو اور ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔ اس مال سے محبت لایعنی ہے اور اسے بڑھاتے چلے جانے کی کوشش اور خواہش بے معنی ہے جو تمہاری ہمیشگی کا ساتھ نہ دے سکے، جو صرف تمہاری فنا کے حوالے سے تمہارا ہو اور تمہارے جوہرِ بقا سے بالکل لا تعلق ہو۔ ظاہر ہے ایسا مال اس دنیا میں نہ پایا جا سکتا ہے نہ رکھا جا سکتا ہے جو خود فنا کے گارے سے بنی ہے۔ یہاں کا اصول یہ ہے کہ بقا کو پانا ہے تو فنا اور اس کے اسباب ومظاہر کو چھوڑتے رہو، یعنی مستقل مال کو حاصل کرنا ہے تو عارضی مال کو لٹانے کا رویہ اختیار کرو۔ یہ ہے وہ نکتہ جس کے پیشِ نظر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو سخاوت کے باب میں نقل کیا۔ یہ حدیث سخاوت کے ظاہر و باطن کو بیان کر دیتی ہے۔ تو مختصر یہ کہ آخرت میں مال جمع کرنا ہے تو دنیا میں مال لٹانے کی روش اختیار کرنی ہے۔ آخرت میں ثروت مندی مطلوب ہے تو یہ شرط ہر حال میں پوری کرنی ہوگی۔ سخاوت کے اور بھی کچھ معانی ہیں لیکن فی الحال ہم سخاوت کو ایک عمل کے طور پر لے رہے ہیں کہ اللہ کو خوش کرنے کے لیے خرچ کرنا اور خرچ کرنے کے اس عمل میں ایک ایسا اطمینان محسوس کرنا جو اللہ کے قرب سے خاص ہے۔ سخاوت سے اللہ کی اطاعت کا محرک تو تقویت پاتا ہی ہے لیکن اس کا اصل نتیجہ اللہ کی محبت کے زندہ اور موجبِ عمل احوال کی صورت میں نکلتا ہے۔ سخی آدمی اگر خود نمائی کے مرض سے محفوظ ہے اور اللہ کی طرف یکسوئی کا ملکہ رکھتا ہے تو اس جیسا عاشقِ حق

کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ ابھی موقع نہیں ہے ورنہ ہم تفصیل کے ساتھ عرض کرتے کہ سخاوت یعنی اپنی دنیا کو اللہ کی خوشنودی کے لیے کمانے اور لٹانے کا مزاج، مزاجِ بندگی ہے۔ آدمی میں اگر سخاوت نہ ہو تو وہ بندگی کے مزاج سے محرومی کی اس انتہا پر پہنچا جاتا ہے جس کی تلافی رسمی نماز روزے سے نہیں ہوسکتی۔ تو مختصر یہ کہ اللہ اور اللہ کی رسول ﷺ کی محبت اس وقت تک پوری طرح نصیب نہیں ہوسکتی جب تک دنیا کے ساتھ استغنا اور بے رغبتی کا تعلق نہ ہو۔ اللہ سے محبت بلکہ اس کی خشیت کا بھی سب سے بڑا ثبوت ترکِ معصیت کے ساتھ حبِ دنیا سے پاک ہونا ہے۔ رمضان میں چونکہ انفاق قانوناً بھی ضروری ہے اس لیے اس ماہِ مبارک میں مارے باندھے کچھ خرچ کر دینا سخاوت نہیں ہوگا۔ سخاوت تو یہ ہے کہ آدمی کو مال سمیٹنے سے وحشت ہو اور بانٹنے سے خوشی۔ ہاں طبیعت کی آمادگی اور دل کے مسلسل تقاضے پر اللہ کی پسندیدہ جگہوں پر خرچ کرتے رہنا، یہ وہ مقام ہے جہاں انفاق اور سخاوت یکجان ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ سخاوت کا کمال یہ ہے کہ وہ انفاق بن جائے اور انفاق میں سچائی یہ ہے کہ وہ سخاوت کے جذبے سے کیا جائے۔

رمضان کچھ دنوں کی دوری پر ہے، بس آیا ہی چاہتا ہے۔ یہ ابھی سے ہمارے ذہن میں بیٹھ جانا چاہیے کہ اس مبارک مہینے میں جیسے دن کا روزہ اور رات کا قیام ضروری ہے، ویسے ہی فیاضی کے ساتھ انفاق بھی ضروری ہے۔ جس نے سخاوت کے جذبے سے انفاق نہیں کیا اس نے رمضان کی ناقدری کی اور اس کا ایک بڑا حق نظر انداز کر دیا۔ خود غرض اور بخیل آدمیوں کی طرح گزارا ہوا رمضان بالآخر شرمندگی کا سبب ہی بنے گا، چاہے رات سجدے میں گزری ہو اور دن روزے میں بیتا ہو۔ رمضان کا بنیادی تقاضا ہی یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے دل کو آزاد کر کے اللہ کی طرف ایک عاشقانہ، مستغفرانہ اور مجاہدانہ یکسوئی اختیار کرو۔ یہ مہینہ بندوں کو موقع دیتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے کہ وہ اپنی محبت کو اللہ کے لیے خاص اور خالص کر لیں۔ تو جو آدمی رمضان میں اپنا مال بچائے، اس کا

مطلب ہے کہ اس کی طبیعت میں دنیا کی محبت غالب ہے اور اس وجہ سے اس کے قلب میں اللہ کی طرف لپکنے کا جذبہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ خود ہی سوچیے وہ کتنا محروم آدمی ہوگا کہ جس کے دل میں اللہ کی طرف یکسوئی کا مادہ ہی نہ ہو۔ آج کل مسجدوں، خانقاہوں اور وعظ و نصیحت کے جلسوں میں اور عام دینی گفتگو میں چند انتہائی ضروری چیزوں کا ذکر بہت کم رہ گیا ہے۔ ان میں سے ایک حبِ مال، حبِ جاہ اور حبِ دنیا ہے۔ زہد کا نام لیتے ہوئے بھی لوگ گھبرانے لگے ہیں، تواضع اب وعظ و نصیحت اور تعلیم و تربیت کا زندہ موضوع نہیں ہے، عزیمت ایک تصور کے طور پر بھی اور ایک خیال کی حیثیت سے بھی آج کے مذہبی ذہن میں موجود نہیں ہے اور خود سخاوت جس پر ہم باتیں کر رہے ہیں، اس پر کاربند ہوکے مریدوں کو اس کی دعوت دینا اچھی بھلی خانقاہوں میں بھی دکھائی اور سنائی نہیں دیتا۔ ظاہر ہے میں سخاوت پر لیکچر دوں گا تو ان لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوگا جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کتنا بخیل ہوں۔ اب اگر میں دوسروں کو سخاوت پر اکسا رہا ہوں تو اس کے پیچھے ضرور میرا کوئی مفاد ہوگا۔ یہ تو گویا اپنے کشکول کا سائز بڑا کر کے شاگردوں اور مریدوں کو سخی بننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

تو خیر، آدمی کے باطن کو برباد کرنے، اس کے دل کو اجاڑنے اور اس کے نفس کو دنائت میں مبتلا رکھنے والی جتنی بھی چیزیں ہیں، ان میں ایک چیز لازماً مشترک ہے، اور وہ ہے دنیا کی محبت۔ یہ ایسی نامراد چیز ہے جس کی موجودگی میں نہ ایمان کے دلائل کارگر ہیں، نہ عبادات کارآمد ہیں اور نہ ہی اخلاق کی کوئی حقیقت ہے۔ یاد رکھنا، دنیا معبود بنے بغیر محبوب نہیں بنتی۔ اسی بنیاد پر ہمارے سلف کہا کرتے تھے کہ حبِ دنیا کی حالت میں نہ ایمان کا اعتبار ہے نہ عمل کا۔ دنیا کی محبت پہلے ہی قدم پر دل کو للّٰہیت سے خالی کر دیتی ہے۔ عاشقِ دنیا یہ کہنے کیا، سوچنے اور محسوس کرنے کے لائق بھی نہیں رہ جاتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ یوں ہی تاکید میں زور پیدا کرنے کے لیے دوسری بلکہ تیسری بلکہ چوتھی بار کہہ

رہا ہوں کہ حبِ دنیا سر سے پاؤں تک قابض ہو جانے والی خرابی ہے جس کے اثرات جزوی نہیں، کلی ہوتے ہیں۔ دنیا محبوب ہو جائے تو معبود بنے بغیر نہیں رہتی۔ یہ اللہ کی جگہ لے لیتی ہے اور دین کا متبادل بن جاتی ہے۔ تو بھائی، اللہ سے کامل بے وفائی کے جہنم میں دھکیل دینے والی اس مصیبت سے بچنا ہے تو سخی بنو، فیاضی کو طبیعت کا حال اور عمل کا شعار بناؤ، اور نیت یہ رکھو کہ یہ سب کچھ اللہ کو خوش کرنے کے لیے ہے۔ یہ نیت اور یہ شعور لازمی ہے ورنہ سخاوت یا تو اسراف ہے یا پھر اپنے احساسِ جرم کو ڈھانپنے اور گناہوں کو چھپانے کی کوشش۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ بہت سے ڈاکو لٹیرے بھی سخی لوگوں جیسے کام کرتے رہتے ہیں۔ تو سمجھ گئے ناں کہ نیت کو خالص رکھتے ہوئے سخاوت کا رویہ اور عمل تمہیں حبِ دنیا سے محفوظ رکھ سکتا ہے ان شاء اللہ۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ دین کے احوالی اور نفسیاتی اسٹرکچرز کی تعمیرِ نو کا کام اس کی ذہنی اور قانونی تشکیلِ جدید سے زیادہ ضروری ہے۔ دین کی تاثیر کے درست چینل کو کھولے بغیر اس کی تعلیم و تعبیر کی سرگرمیاں کافی نہیں ہیں۔ بندگی کا صحیح علم ظاہر ہے کہ بہت ضروری ہے، بہت ہی ضروری، لیکن صحیح علم بھی تفہیم کے ساتھ بلکہ تفہیم سے بڑھ کر تاثیر کا تقاضا کرتا ہے۔ دینی علم صرف خیال نہیں ہے، حال بھی ہے۔ یہ ذہن کے راستے سے قلب پر حکومت کرتا ہے، یہ ذہن کو بیدار کر کے قلب کی زندگی بنتا ہے۔ ہمارے ساتھ بہت بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم نے دماغ کو بلکہ حافظے کو دینی علم کے لیے ایک گنبدِ بے در بنا رکھا ہے جس میں دین محبوس ہو کر رہ جاتا ہے اور اسے قلب تک پہنچنے کا راستا نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا علمِ دین روحانی، طبعی اور اخلاقی نتائج نہیں پیدا کر رہا۔ ہمارے لیے دین زیادہ سے زیادہ کچھ جامد تصورات اور انسان کی داخلی و خارجی صورتِ حال سے لاتعلق بے لچک قوانین کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ کہاں کے احوال اور کیسے اخلاق، بلکہ کون خدا اور کیسا بندہ! ہم یہاں تک پہنچ چکے ہیں، بس اس کا ادراک کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہی حال رہا تو یہ ڈر بھی کسی دن ختم

ہو جائے گا۔ دینی تعلیم و تعلم وغیرہ کا یہ مشینی سا عمل اس وقت بھی جاری رہے گا اور لوگ خود کو مسلمان ہونے سے بچاتے ہوئے مسلمان سمجھتے رہیں گے۔ اللہ وہ دن نہ دکھائے اور اس سے پہلے ہی اپنے پاس بلا لے۔ آمین۔

حبِ دنیا کا ایک حصہ حب مال ہے اور دوسرا حبِ جاہ۔ یعنی خود کو بڑا بنانے اور اپنی بڑائی کو دوسروں سے منوانے کی خواہش۔ سخاوت سے مال کی محبت حد سے تجاوز نہیں کرتی اور اپنی سخاوت کو چھپانے سے بڑائی کی خواہش سر نہیں اٹھاتی۔ سخی آدمی کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ اپنی سخاوت کو چھپانے کی کوشش کرے تا کہ بڑا کہلانے اور واہ واہ کروانے کی خواہش نہ پیدا ہو۔ وہ آدمی ایک الٰہی مہر کی تصدیق کے ساتھ حبِ دنیا سے آزاد ہے جس میں نہ مال کی محبت ہے، نہ بڑائی کی خواہش ہے اور نہ ہی ناموری کی تمنا۔

آج کی صورتِ حال ایسی ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کے عاشق جیسا نظام العمل اختیار نہیں کرتا، دنیا کا بندہ بنانے والے اعمال انجام نہیں دیتا تو وہ کٹ کھنی، سفاک اور حیوانی خود غرضی سے بنی ہوئی دنیا میں survive نہیں کر سکتا۔ یہ بات اب لوگوں کے ذہن میں جیسے بیٹھ گئی ہے کہ دنیا کو حاصل کرنا ہے تو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تو ایک ایسے ماحول میں جہاں ہر سانس، ہر منظر، ہر قدم دنیا کی محبت بڑھانے کا ذریعہ بن رہا ہو، وہاں اس آسان سی تدبیر کو، یعنی سخاوت کو قدر دانی کے ساتھ اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔ اور خصوصاً ایسے حالات میں کہ حبِ دنیا ہوا میں شامل ہے، پانی میں ملا ہوا ہے، اپنی حفاظت کی طرف سے حساس اور چوکس نہ رہنا پرلے درجے کی بے وقوفی اور بے حسی ہے۔ تو جناب، رمضان سے پہلے کے ان دو ہفتوں کو کام میں لائیں اور نیت کے اخلاص کے ساتھ سخاوت کا شیوا اختیار کریں اور اس میں کسی طرح کا دکھاوا نہ آنے دیں۔ جس کو اس مشورے کی ضرورت ہے وہ اس پر سچائی، سنجیدگی اور استقامت کے ساتھ عمل کر کے دیکھ لے گا کہ رمضان کی حقیقی تاثیر اور برکت کیا ہوتی ہے اور اللہ کا محبوب واحد

ہونا بندے کو کن احوال میں رکھتا ہے۔ اللہ کو محبوب بنا لینے کے لیے یہ دو ہفتے بھی بہت ہیں، پھر ان شاء اللہ رمضان اللہ کا دوست اور اس کا محبوب بن کر گزارو گے۔ تو بس ابھی سے ارادہ کر لیجیے کہ مجھے شعبان میں سخی بننے کی مشق کرنی ہے تاکہ رمضان میں سخاوت کا عمل ایک سرخوشی اور شکر گزاری کے ساتھ انجام دیتا رہوں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ بعض لوگ طبعاً مسرف اور فضول خرچ ہوتے ہیں، وہ سو روپے کا جوتا نہیں لیتے جب تک اس کی قیمت دس ہزار نہ ہو۔ ان لوگوں کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ بازاروں کے شوقین ہوتے ہیں اور کوئی چیز خریدتے وقت یہ بالکل نہیں دیکھتے کہ ہمیں اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بخل بھی بڑی برائی ہے مگر اسراف اس سے بھی بڑی خرابی ہے کیونکہ اس میں نفس پرستی شامل ہے۔ تو اسراف اور سخاوت بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ ایک لا پروائی ہے اور دوسری ذمے داری۔ مسرف اللہ سے غافل ہوتا ہے اور سخی اللہ کی حضوری میں رہتا ہے۔ مسرف خود پسند اور نفس پرست ہوتا ہے جبکہ سخی اللہ کا دوست اور اللہ کا محبوب ہے۔ اسراف میں دکھاوا لازم ہے اور سخاوت میں اخفا۔ غرض اپنی نفسیاتی ساخت میں بھی مسرف اور سخی کی شخصیات متضاد شخصیات ہیں۔ میں نے اللہ کے فضل سے بہت بڑی ہستیوں کو دیکھ رکھا ہے، سب کے سب انتہا درجے کے فیاض تھے۔ میں نے کسی سخی آدمی کو اللہ کا دوست بنے بغیر دنیا سے جاتے نہیں دیکھا۔ مطلب، کئی لوگ دیکھے جو نماز روزے میں کوتاہی کرتے تھے اور لاابالی پن کی زندگی گزار رہے تھے لیکن طبعاً اور عملاً بہت سخی تھے اور ان کی سخاوت کے پیچھے یہی جذبہ تھا کہ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو میں نے دیکھا کہ مرنے سے پہلے ولی اللہ بنے۔ زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے جیسے بھی گزارا ہو مگر سخاوت کی برکت ایسی تھی کہ اللہ نے انہیں اپنا دوست بنا کر اپنے پاس بلایا۔ گو کہ ہم اپنے اردگرد کے لوگوں میں کسی کے بارے میں یقین سے نہیں جان سکتے کہ وہ ولی اللہ ہے کہ نہیں، لیکن دل بہرحال یہی گواہی دیتا ہے کہ وہ حضرات اللہ کے دوست

بن کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اللہ اس گواہی کو سچا بنائیں۔ جسے انابت نصیب ہو جائے وہ اللہ کا دوست ہی ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی میں بات کر رہا ہوں وہ سب مرنے سے پہلے صاحبِ انابت بن چکے تھے ان شاء اللہ۔

شاید پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ ہر آدمی کو اپنے اوپر لازم کر لینا چاہیے کہ وہ رات کو بستر پر نہ جائے جب تک اس دن میں ہونے والی نیکیوں پر شکر نہ ادا کر لے اور اس دن میں سرزد ہونے والے گناہوں کو معاف نہ کروا لے۔ استغفار ایسا کرو کہ دل کو مغفرت کی ٹھنڈک محسوس ہو جائے اور نیکی پر شکر ایسے ادا کرو کہ اللہ کی محبت میں ترقی کا احساس نصیب ہو جائے اور اپنی ناچیزی کا یقین اور پختہ ہو جائے۔ شکر جو ہے وہ نیکی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھنے دیتا۔ شکر کو اگر سمجھ لیتے تو ہم سب سخی ہوتے، بے نفس ہوتے، عاجز اور منکسر المزاج ہوتے۔ آدمی کو اللہ کا خالص بندہ بننے کے لیے جس بے نفسی اور عاجزی کی ضرورت ہے، وہ شکر کی بدولت میسر آ جاتی ہے۔ شکر سے دل بھی نرم ہو جاتا ہے، کیونکہ ہر چیز کو اللہ سے منسوب رکھنے والا، ہر چیز سے اپنا دعوائے ملکیت مٹا دینے والا لازماً نرم دل ہوگا، یقیناً منکسر المزاج ہوگا، حتماً سچا ہوگا اور قطعاً بے نفس اور بے لوث ہوگا۔ تو نیکی پر شکر ادا کرو اور پھر گناہ پر استغفار ایسی سچائی کے ساتھ کرو کہ خود تم پر یہ یقین رکھنا واجب ہو جائے کہ جس گناہ پر توبہ کی ہے وہ گناہ اللہ نے معاف کر دیا۔ اور اس روزانہ کے محاسبے میں ایک چیز الگ سے بڑھا لو کہ آج میں نے اللہ کے راستے میں کیا خرچ کیا۔

رمضان کی اچھی تیاری کرنے کے لیے عبادات میں کثرت اختیار کرنے کی کوشش ابھی سے شروع کر دیں، کچھ روزے رکھ لیں، کچھ نوافل کا اہتمام کر لیں اس نیت کے ساتھ کہ انہیں ہمیشہ جاری رکھنا ہے اور ذکر و تلاوت کی مقدار میں بھی اضافہ کریں اور معیار پر بھی زیادہ توجہ دیں۔ رمضان محنت کا مہینہ بھی ہے، اس لیے شعبان ہی سے محنت شروع کر دینی چاہیے، خاص طور پر عبادات میں محنت۔ یہ سب ابھی سے کر لیں تو ان

شاء اللہ رمضان شریف میں داخلہ ایک گھر والے کی طرح ہوگا، اجنبی کی طرح نہیں۔

پچھلے جمعے کو ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ شرک کی اصولی تفصیل کیا ہے؟ اس وقت جواب کا موقع نہ تھا، میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ اگلی مجلس میں پوچھ لیجیے گا۔ ابھی جو صاحب سرگوشی کر کے گئے ہیں، یہ وہی تھے اور مجھے اپنا سوال یاد دلا گئے ہیں۔ شرک کی تمام تفصیلات اور شرکیہ خیالات و اعمال کی فہرست تو بہت سی کتابوں میں ملتی ہے، وہیں دیکھ لینی چاہیے۔ کیونکہ گفتگو میں عین ممکن ہے کہ کچھ ضروری چیزیں چھوٹ جائیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم توحید کے بنیادی اصول اور حقوق سمجھ لیں، اسی سے شرک کی اصولی تفصیل بھی سامنے آجائے گی کیونکہ شرک توحید کی خلاف ورزی ہی کو تو کہتے ہیں۔ توحید کے بارے میں پہلی ضروری بات تو یہ ہے کہ اس کی تصدیق جزوی نہیں، کلی اور مجموعی ہوتی ہے۔ توحید محض ایک قانونی حکم نہیں ہے جو کچھ اعمال کرنے اور کچھ سے بچنے کا تقاضا کرتا ہے، اسی طرح یہ صرف ایک اعتقادی امر نہیں ہے، یعنی اللہ کو ایک مان لینے سے اس کے تمام مطالبات کی تعمیل نہیں ہوجاتی۔ توحید یقیناً حکم بھی ہے اور عقیدہ بھی ہے لیکن اس کا حکم ہونا اور عقیدہ ہونا صرف عمل اور تصور بن جانے تک محدود نہیں ہے۔ توحید کی تصدیق میں آدمی کے پورے وجود اور سارے شعور کو صرف ہونا چاہیے ورنہ حکمِ توحید کی تعمیل صحیح ہونے کے باوجود ناقص ہے اور عقیدۂ توحید کی تسلیم درست ہوتے ہوئے بھی کامل نہیں ہے۔ توحید اگر وجود کی شرطِ واحد اور شعور کا بنیادی تناظر نہ بنے تو ہم نے اس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ یہ وہ سانچا ہے جس میں ہمارے ہونے کے احوال ڈھلتے ہیں اور ہمارے شعور کی تقویم ہوتی ہے۔ اس realization کے بغیر ادھورا سا فہمِ توحید تو حاصل ہوسکتا ہے لیکن بندہ ذوقِ توحید سے محروم رہ جاتا ہے۔ فہم اور ذوق کا فرق

تو آپ سمجھتے ہی ہوں گے، ان کے درجات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فہم کی تشکیل صرف ذہن میں ہوتی ہے جبکہ ذوق کی تشکیل میں قلب اور ذہن مل کر شریک ہوتے ہیں۔ یعنی ذوق وجود وشعور کی ہم احوالی ہے جس سے تمام خیالات وتصورات، جذبات واحساسات اور اعمال وافعال پیدا ہوتے ہیں۔ تو خیر، اس وقت ہمارا مقصودِ کلام یہ ہے کہ توحید کی ایسی اصولی تفصیل کر دی جائے کہ شرک کسی راستے سے بھی قلب وذہن میں داخل نہ ہو سکے۔ تو دیکھیے، لا الہ الا اللہ کلمۂ توحید ہے، اس کلمے کو درست فہم کے ساتھ اور سنجیدگی سے زبان سے ادا کیا جائے اور قلب وذہن میں حاضر رکھا جائے تو شرک کا ظاہر وباطن آشکار ہو جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ نہیں کوئی الٰہ مگر اللہ، یعنی الٰہ تو بس اللہ ہے، تو یہاں الٰہ کے کچھ معانی ہیں جو ہمیں معلوم ہونے چاہییں۔ ان کی روشنی میں خود بخود پتا چل جائے گا کہ شرک کیا ہوتا ہے اور اس کی عملی، ذہنی اور مزاجی صورتیں کیسی ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے اعمال تو شاید موحدانہ ہوں لیکن مزاج مشرکانہ ہے۔ ظاہر ہے مشرکانہ مزاج کے ساتھ موحدانہ عمل کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تو مزاج میں شرک کی آمیزش سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ الٰہ کے اصولی اور لازمی مطالب ومفاہیم ذہن میں راسخ اور دل میں حاضر رہیں۔ 'الٰہ' کا ایک مطلب ہے وہ ہستی جس کی عبادت کی جائے، دوسرا مطلب ہے وہ ہستی جس کی قدرت مطلق اور کامل ہے اور وہ اسباب وذرائع کا پابند نہیں ہے، تیسرا مطلب ہے وہ ہستی جس کی اطاعت کی جائے اسے حاکمِ مطلق مان کر، اور چوتھا مطلب یہ ہے کہ وہ ہستی جس سے محبت کی جائے۔ تو یہ چار بنیادی مطالب ہیں جن سے بے شمار اور مطلب بھی نکلتے ہیں۔ 'اللہ ہی الٰہ ہے' کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی قادر ہے اس کے آگے سب بے بس اور لاچار ہیں، وہی حاکم ہے اور اس کی حکومت میں کوئی شریک نہیں اور سب اس کے محکوم ہیں، اور وہی محبوب ہے اور اس کی طرح کوئی محبوب نہیں ہے۔ تو یہ اللہ کے چار حقوق ہیں جن کی ادائی میں

مجھے وجود و شعور کی یکجائی کے ساتھ مشغول رہنا ہے۔ جو چیز بھی ان میں خلل ڈالے گی وہ معصیت ہے اور اگر شعور کے ساتھ اختیار کر لی جائے تو شرک ہے۔ شرک کی بھی چار بڑی قسمیں ہیں۔ غیر اللہ کو معبود بنا لینا، کسی سے ایسی محبت کرنا جیسی اللہ سے کی جاتی ہے، کسی کی ایسی اطاعت کرنا جو صرف اللہ کا حق ہے اور کسی سے ایسی امیدیں رکھنا جو قادرِ مطلق ہستی ہی سے رکھی جاسکتی ہیں۔ الٰہ کا اصلی مطلب معبود ہے، اس لیے اصلی شرک شرک فی العبادت ہے۔ قدرت، حکومت، محبوبیت وغیرہ معبودیت کے لوازم ہیں، یعنی اللہ قادر، حاکم اور محبوب نہ ہو تو اُس کا معبود ہونا حقیقی نہیں رہتا۔ اسی طرح یہ تو ہوسکتا ہے کہ آدمی اصلِ شرک یعنی شرک فی العبادت کا مرتکب نہ ہو مگر شرک کے باقی تین لوازم اور عناصر اپنے اندر رکھتا ہو۔ ایسی حالت میں اس کا شرک فی العبادت کا مرتکب نہ ہونا اس کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ احتیاط کی جائے گی کہ اسے مشرک کا لقب نہ دیا جائے لیکن یہ رعایت بھی ایسی ہے کہ دل کو مطمئن نہیں کرتی بلکہ لرزا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ فکر پیدا ہوجاتی ہے کہ خود کو یقین کے ساتھ مسلمان سمجھنے والا بندہ بھی شرک کا شکار ہوسکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ صدیوں سے امتِ مسلمہ میں مشرکانہ خیالات اور رسم ورواج کا دور دورہ ہے اور ایک ایسی نفسیات بہت وسیع پیمانے پر پیدا ہوچکی ہے جس میں اللہ کی محبوبیت وغیرہ کے لیے فی الحقیقت کوئی جگہ نہیں رہ گئی۔ ایسے لوگ توحید کا بس ایک ہی تقاضا سمجھتے ہیں کہ اللہ کو گنتی کا ایک مان لیا جائے اور اس کے سوا کسی کے آگے عبادت کی نیت سے سجدہ نہ کیا جائے۔ یہ بے وقوف عبادت کا مطلب ہی نہیں جانتے، انہیں کیا پتا کہ عبادت کسے کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو عبادت چند مخصوص اعمال تک محدود ہے، انہیں جیسے تیسے بجالاتے رہو، پھر سب خیر ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ کسی کو عالم الغیب سمجھنا اور کسی کو مشکل کشا پکارنا اسے معبود بنا لینا ہی ہے۔ تو بہرحال ان چار معیارات پر خود کو پرکھتے رہنا چاہیے تاکہ پتا چلتا رہے کہ ہم توحید کے ذوق اور مزاج پر مضبوطی سے قائم

ہیں یا نہیں۔ یہ یاد رکھنا کہ ذوقِ توحید اور مزاجِ توحید اللہ کو محبوب ماننے اور محبوب بنائے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ توحید میں سچا ہونے کا سب سے یقینی ثبوت ہے۔ میری ہر محبت دراصل اللہ ہی کو محبوب بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ میں اولاد سے بھی محبت کرتا ہوں تو اس محبت کا بھی مقصود یہ ہے کہ اللہ کو محبوب بنانے کا عمل جاری رہے۔ اللہ کے سوا کوئی محبوب ایسا نہیں ہے جو میری تمام محبتوں کی پہلی وجہ اور آخری منزل بن سکے۔ یہ محبت ہی تو ہے جو مجھے اس کی طرف یکسو رکھتی ہے اس کی صحیح معرفت کے ساتھ، اپنی درست پوزیشن کے ساتھ اور شعور وجود کے حقیقی احوال کے ساتھ۔ یہ محبت ہی میری خودی کے تمام حقائق اور امکانات کو عمل میں لاتی ہے۔ تو بھائی، آج سے طے کرلیں کہ میں کوئی ایسی بات نہیں مانوں گا جو اللہ کے کسی حکم سے ٹکراتی ہو، میں کسی بھی ہستی میں ایسا کوئی اختیار نہیں مانوں گا جس سے اللہ کی قدرت کا تصور مجروح ہوتا ہو اور میں کسی سے ایسی محبت نہیں کروں گا جس سے اللہ کی محبوبیت متاثر ہوتی ہو یا جو اللہ کی محبت سے پیدا نہ ہوئی ہو اور اس میں اضافے کا ذریعہ نہ بنتی ہو۔ اوروں کا تو کیا ذکر، خود اللہ کے حبیبِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں بھی یہ شرطِ لازم ہے کہ اس کی بنیاد بھی اللہ کی محبت ہو اور اس کا نتیجہ بھی۔ کیا شان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہ ہو تو اللہ کی محبت نفس کا دھوکا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت اول و آخر نہ ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا دعوا جھوٹا ہے۔ حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اللہ کا عاشق بننے کا کوئی راستا ہے ہی نہیں اور محبتِ الٰہی کے سوا عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی منزل ہے ہی نہیں۔ شرک ہمیشہ مقدس ہستیوں کی آڑ لے کر داخل ہوتا ہے۔ بہت ہوشیار رہنا چاہیے کہ ہم اللہ کے دوستوں کو اپنے لیے اللہ سے بھاگنے کا ذریعہ تو نہیں بنا رہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ مقدس ہستیوں سے ہماری محبت ایسی صورت اختیار کر گئی ہو کہ اللہ کو محبوب رکھنے کی ہمیں ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی ہو! کون ہے جو نہیں جانتا اور کون ہے جو نہیں دیکھتا کہ ہم نے خدا پرستی کے جذبات کو شخصیت پرستی میں کھپا دیا

ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم، یا علی اور یا غوثِ اعظم کی ندائیں تو جذباتِ محبت سے چھلک رہی ہیں لیکن یا اللہ کی رسمی سی پکار یوں لگتا ہے جیسے کسی مردے کے حلق سے نکل رہی ہو۔ ایسی محبتیں زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ یہ اللہ سے لاتعلق کر دیتی ہیں اور اس لاتعلقی کا احساس بھی نہیں ہونے دیتیں۔ آدمی یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ اللہ کے محبوبوں سے محبت کر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے مستند دوستوں سے محبت کے نام پر وہ اللہ سے لاتعلقی اور غفلت کو خود پر طاری کیے رہتا ہے۔ اب وہ کبھی اللہ کی قدرت پر ضرب لگاتا ہے، کبھی حاکمیت پر، کبھی بے نیازی پر اور کبھی اللہ کے معبودِ انبیا اور حاکمِ مرسلین علیہم السلام ہونے کے پہلو پر چوٹ لگاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ دینی جذبے کے ساتھ کرتا ہے۔ اپنی محبوب ہستیوں میں الوہیت کے عناصر پیدا کر کے بہانہ یہ بناتا ہے کہ یہ الوہی اوصاف عطائی ہیں، ذاتی نہیں۔ یعنی یہ اوصافِ الوہیت انہیں اللہ نے عطا کیے ہیں۔ مشرکینِ مکہ بھی اپنے بتوں کے لیے یہی تو کہا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی محبت کو کامل الایمان بننے کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ کمالِ ایمانی کسے کہتے ہیں؟ کمالِ ایمانی یہ ہے کہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ اللہ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں۔ اور اب اللہ سے تعلق کا ہر راستا تعلق بالرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکلتا ہے۔ اللہ سے تعلق چونکہ محبت کیے بغیر کامل نہیں ہوسکتا لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت لازمی ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ مبارک کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنی اولاد وغیرہ سے بڑھ کر محبوب بنائے بغیر تم پر اللہ کی محبت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ اللہ اسی کا محبوب ہے جو میرا عاشق ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی کے محبوب ہیں جو الٰہِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مُحب ہے۔

شکر اور استغفار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

عَنْ أَبِی عَمْرٍو سُفْیَان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال: قُلْتُ: یا رسولَ اللّٰہِ قُلْ لی فی الإسلامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْہُ أَحَدًا غَیْرَکَ قال: ((قُلْ: آمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) رواہ مسلم

جناب ابوعمرو سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گزارش کی کہ مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی کافی نصیحت فرما دیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مجھے کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ پر ایمان لاؤ پھر اس پر جم جاؤ۔ یہ حدیث مسلم میں ہے۔

عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((قَارِبُوا وَسَدِّدُوا، وَاعْلَمُوا أَنَّہُ لَنْ یَنْجُوَ أَحَدٌ مِنْکُمْ بِعَمَلِہِ)) قَالُوا: یَا رَسُولَ اللّٰہِ وَلَا أَنْتَ؟ قَالَ: ((وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَۃٍ مِنْہُ وَفَضْلٍ)) رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ دین کی راہ چلو اور اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ اور یہ سمجھ لو کہ کوئی شخص محض اپنے عمل کے سبب نجات نہیں پا سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالی مجھے اپنے فضل و رحمت کے سائے میں ڈھانپ لے۔ (مسلم)

ان دونوں حدیثوں کو ملا دیں تو ایک بہت ضروری اور بنیادی ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو ہمیں اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنا ہے اور اپنی پوری زندگی کو ایک ایسے بندے کے طور پر گزارنا ہے جو اللہ کو اپنا حاکم اور معبود مانتا ہے۔ اگر ہماری زندگی کے کچھ حصے اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے کہ ہم اللہ کو اپنا حاکم اور معبود مانتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے ایمان میں اسی قدر سچائی کم ہے۔ یعنی اپنی زندگی کو اس کے ایک ایک لمحے اور اس کے ایک ایک مقصد کے ساتھ اللہ کے حکم اور مرضی کے تابع نہ رکھنا گویا اللہ تبارک وتعالی کے ساتھ تعلق کو سچا نہ رکھنے کے برابر ہے۔ جس نے بھی اللہ کو مان لیا کہ وہ مجھ پر اور اس ساری کائنات پر حاکم ہے، تو اللہ کو اس طرح ماننے کے بعد اس پر یہ فطری طور پر لازم ہے کہ اللہ تبارک وتعالی پر جو ایمان اسے نصیب ہوا ہے، اس کی ساری زندگی یعنی اس کے سارے اعمال، اس کی تمام خواہشات، اللہ کے حکم اور اس کی مرضی کے تابع ہوں۔ یعنی ایمان لاتے ہی مجھ پر جو پہلی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ میرا عمل اللہ کے حکم کے تحت اور میری خواہش اللہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ میں اپنے ہر اس عمل کو رد کروں گا، اس پر توبہ کروں گا، جو اللہ تبارک وتعالی کے حکم کے خلاف ہے یا جس کا سبب اللہ تبارک وتعالی کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر میں اپنی ہر اس خواہش کو اپنے دل سے نکال پھینکوں گا، جس کے بارے میں خود مجھے

معلوم ہے، خود مجھے یقین کے ساتھ پتا ہے کہ اس طرح کی خواہش رکھنا اللہ کی مرضی کے خلاف ہے۔ ان دو پہلوؤں سے، ان دو چیزوں کے بارے میں ہوشیار رہتے ہوئے، اللہ کے ساتھ وفادار رہتے ہوئے، جس نے بھی اپنی زندگی گزار لی، اس نے گویا ایمان لانے کا حق ادا کر دیا۔ اس نے گویا مسلمان ہونے کی سب سے بنیادی ذمہ داری ادا کر دی۔ یہ بات بظاہر خیالی اور رومانوی سی لگتی ہے کہ آدمی اپنی خواہشات کو طبیعت سے کھرچ دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ جدیدیت نے انسان اور اس کے احوال و مقاصد کے بارے میں جو تصورات بنائے ہیں، اُن کو اندھا دھند قبول کر لینے کے نتیجے میں آج یہ چیز بہت غیر مانوس لگنے لگی ہے کہ انسانوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ شخصیت میں تنوع کے تمام عناصر کو کسی ایک ہی نقطے میں سمیٹ کر دکھائیں۔ ہم چونکہ دین کے ساتھ اپنے تعلق کو کچھ رسمی صورتوں اور چند بے لچک سطحی تصورات تک محدود رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں، اِس لیے دین کے ودیعت کردہ تصورِ انسان اور شعورِ مقاصد سے اتنے دور جا پڑے ہیں کہ خود ہمیں اپنے دین کے بنیادی ترین مطالبات بھی idealistic یعنی، دوسرے لفظوں میں، ناقابلِ عمل محسوس ہوتے ہیں۔ چونکہ اِن مطالبات کی سند یعنی اِن کا متن اتنا قطعی اور دوٹوک ہے کہ اُس کا انکار تو دور کی بات ہے، اُسے تاویل کے نام پر توڑا مروڑا بھی نہیں جا سکتا لہٰذا ہم نے دل میں ایک چور پال لیا ہے جو لفظوں میں نقب لگا کر انہیں معنی سے خالی کر دیتا ہے۔ ہم نے حقائق اور مقاصد کے ساتھ ہم آہنگی کا تقاضا کرنے والے احکام کو محض الفاظ کا مجموعہ اور دل فریب آوازوں کا سازینہ بنا رکھا ہے۔ احکام کے وہ معانی جن کی بنیاد پر وجود اور شعور کی تکمیل و تشکیل کا عمل چلتا ہے، وہ اللہ اور ہمارے بیچ میں سے غائب ہو گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دین ہمارے اندر کوئی بلندی، کوئی اٹھان نہیں پیدا کرتا اور بس ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی بن کر رہ گیا ہے جسے لاتعلقی کی دھند نے لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس صورتِ حال میں بہت ضروری ہو چکا ہے کہ دین کو اس کے

حقائق و مقاصد کے ساتھ کسی کمی بیشی کے بغیر پیش کیا جائے اور اللہ کے ساتھ اس فطری اور معیاری تعلق کو بحال کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے جس کے بغیر ہم پر خود ہماری حقیقت کا انکشاف ہوسکتا ہے اور نہ ہی ہماری شخصیت میں سکڑنے کا عمل رک سکتا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم کتنی تیزی سے محض ایک حیوانی وجود بنتے جارہے ہیں جس کے لیے صرف جسم اور جسمانیت حقیقی ہے، باقی سب کہانیاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دین کو اس طرح نہیں پیش فرمایا کہ تمہاری ساری زندگی، تمہاری ساری شخصیت اور تمہارے تمام حالات اس کا موضوع نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جو دین لے کر آئے تھے، اس دین کا اولین مطالبہ اور رسول اللہ ﷺ کا اس دین کو ماننے اور عمل کرنے کا اسوہ یہ ہے کہ میرے تمام حالات، میرے سارے احوال اور میرے کل افعال اور اعمال اس دین کے تابع ہوں گے ورنہ میں ان کی تردید کرنے کا، ان سے چھٹکارا پانے کا، ان سے نجات پانے کا، ان پر توبہ کرنے کا پابند ہوں۔ یہ دین ہمارے کچھ اجزا سے مخاطب نہیں ہے۔ یہ دین کہتا ہے کہ اپنے آپ کو کل کا کل میرے سپرد کرو۔ اللہ تبارک وتعالی ایسا نہیں ہے کہ اس نے میرے صرف ہاتھ پاؤں بنائے ہوں، ذہن اور قلب نہ بنایا ہو۔ جس طرح اللہ نے مجھے پورے کا پورا بنایا ہے، میں پورے کا پورا اللہ کی مخلوق ہوں، اسی طرح میں پورے کا پورا اللہ کا بندہ ہوں۔ تو میری آپ کی دو ذمہ داریاں ہیں، رسول اللہ ﷺ کی یہ میراثِ ہدایت ہے کہ ہم اس مزاجِ دین کو سمجھیں اور خود کو اس کے مطابق بنانے کی ہر ممکن کوششوں میں مرتے دم تک لگے رہیں۔ آپ سمجھ گئے ناں!

تو ہماری کیا دو ذمہ داریاں ہیں؟ یہ کہ ہم اور ہماری زندگی اور ہمارے دائرۂ اختیار میں آنے والا ماحول اللہ کے حکم سے متصادم نہ رہے، یہ پہلی ذمہ داری ہے۔ دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ میں، میری طبیعت، میرا دل، میرا دماغ اور میرے اختیار سے پیدا ہونے والا ماحول، یہ سب کا سب اللہ کی مرضی کے مطابق رہے۔ میرے افعال اللہ کے حکم کے

تابع رہیں، میری خواہشات اللہ کی مرضیات سے نسبت رکھنے والی ہوں۔
بندگی، سبب وجود ہے، اس کے علاوہ ہمارے جینے مرنے کا کوئی سبب نہیں ہے،
اس کے علاوہ ہمارے موجود ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ہم صرف ایک معنی رکھنے
والے لفظ کی طرح ہیں اور ہمیں اس معنی کی پوری حفاظت کرنی ہے۔ اور ہمارا وہ واحد معنی
یہ ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ ہماری ہر حیثیت جب تک اس بندگی سے تصدیق نہیں
پائے گی، وہ حیثیت شیطانی ہے، وہ حیثیت نفسانی ہے، وہ حیثیت مضر ہے، وہ حیثیت
خطرناک ہے، وہ حیثیت بے وقعت ہے۔ ہماری تمام حیثیتیں اگر بندگی کے اصول سے،
بندگی کی کسوٹی پر، پرکھ کر کھری ثابت ہوتی ہیں تو ہماری ہر حیثیت قابلِ قدر ہے۔ اور اگر
ہماری کوئی پہچان، بندگی کی پہچان سے تصادم کی حالت میں ہے تو ہم اپنی اس پہچان
سمیت شیطان کے بندے ہیں، ہم اپنے نفس کے بندے ہیں۔ مطلب، رسول
اللہ ﷺ ہمیں کوئی اختیاری چیز دے کر نہیں گئے کہ جب چاہو جیب سے نکال کر دین کا
حکم دیکھ لو اور جب چاہو اس کتابِ احکام کو بند کر کے طاق پر رکھ دو۔ یہ دین اس طرح
نہیں آیا ہے۔ اس دین کا مطالبہ ہے کہ میں تمہارے پورے وجود کا واحد سانچا ہوں اور
تمہاری کیا مجال ہے کہ تم اس میں ڈھلنے سے انکار کر دو۔ ٹھیک ہے ناں! تو اس مطالبے کو
اس کی پوری خدائی شان اور الوہی شکوہ کے ساتھ سمجھیں گے تو پھر مسلمان ہونے کے عمل
میں آسانی پیدا ہوگی، کشادگی پیدا ہوگی۔ پھر ایمان کی تہ داریاں تم پر کھلنے لگیں گی۔ جب
تم یہ کہو گے کہ میں اللہ کا بندہ ہونے کے علاوہ نہ کوئی معنویت رکھتا ہوں، نہ کوئی ہستی رکھتا
ہوں، نہ کوئی قدر و قیمت رکھتا ہوں۔ جیسے ہی تم نے دل اور دماغ اور ارادے کی یکجائی اور
اشتراک کے ساتھ اس کو مان لیا اور اس کو اپنا مقصدِ ہستی بنا لیا تو اسی وقت ایمان کی
گہرائیاں تم پر اللہ منکشف کرے گا۔ اسی کے ذریعے سے اسلام کی وسعتیں تمہیں اللہ تعالیٰ
نصیب کرے گا اور اسی کی بدولت تمہیں اللہ تعالیٰ اپنا تعلق چکھا دے گا۔ لاکھ کہتے رہو

میں اللہ سے بھی تعلق رکھتا ہوں۔ لیکن اگر اللہ کا تعلق تمام تعلقات کی لذتوں پر غالب لذت نہیں ہے تو وہ کیا تعلق ہے؟ تم کہتے ہو میرا بیٹے سے تعلق ہے۔ بالکل ٹھیک، کیونکہ بیٹے کی محبت تمہارے اعصاب میں ارتعاش رکھتی ہے۔ تم کہتے ہو تمہیں دولت سے تعلق ہے۔ تم اس میں بالکل سچے ہو کیونکہ دولت کا آنا تمہیں خوشی سے بے حال کرتا ہے اور جانا تمہیں چارپائی پر پھینک دیتا ہے۔ تو اس میں تم بالکل سچے ہو کیونکہ اس تعلق کی تمہارے حواس تصدیق کرتے ہیں۔ تمہارے احساسات اس کی تائید کرتے ہیں۔ تو کیا تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق ہے؟ جیسا تعلق اپنے مال سے، اپنی اولاد سے، اپنے گھر سے، اپنی جاب سے ہے۔ یعنی کیا تم اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق رکھتے ہو جس کی تصدیق، احساسات وجذبات سے بھی ہوتی ہو؟ یعنی تمہیں بارہا یہ محسوس ہوتا ہو کہ یا اللہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا، یا اللہ میرے اوپر کوئی سایہ نہیں ہے، جو بھی میرے اوپر سایہ ہے وہ آپ کی رحمت کا سایہ ہے، یا اللہ میری کوئی منزل ایسی نہیں ہے جو میرے دل کو کھینچتی ہو سوائے آپ کے، یا اللہ کوئی راستا ایسا نہیں ہے جس پر میں اپنے پورے دل اور جذبے کے ساتھ چلتا رہوں سوائے اس راستے کے جو آپ نے مجھے بتایا، بنایا اور جس پر رسول ﷺ کی رہنمائی میں چلوا کے دکھایا۔ تو اب اگر اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق تمہارے احساسات وجذبات کا واحد موجب نہیں ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت تمہیں محبت محسوس کرنے والے نظام کے ساتھ حاصل نہیں ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی خشیت تمہیں گناہ سے بھگانے کا سب سے مؤثر ذریعہ نہیں ہے، تو پھر اللہ سے تعلق تو محض ایک ٹوٹے پھوٹے حیوانی حافظے کے ساتھ ہے۔ حیوانی حافظہ اس طرح کہہ رہا ہوں کہ اللہ پر ایک بہت ہی چھوٹے ذہن کے ساتھ، اپنے ذہن کی بہت ہی کمزور فیکلٹی کی بنیاد پر میں نے اللہ پر ایمان لا کر اسے حافظے میں رکھ لیا ہے اور اس کا کوئی بھی اثر میرے احساسات، میرے خیالات اور میرے اعمال پر نہیں پڑ رہا۔ میں عمل اور جذبات کی سطح

پر حیوان ہوں اور میرا ایک سکڑا ہوا انسان ہے جو معطل ہے۔ اس معطل اور بے اثر اور بے مصرف انسان نے اللہ کو مان رکھا ہے، باقی میں سارے کا سارا حیوان ہوں۔ تو اس پر شرم کرنی چاہیے، غیرت کھانی چاہیے اور توبہ کرنی چاہیے۔ بہانے نہیں بنانے چاہمیں۔ آدمی اپنی سب سے بڑی دولت سے محروم رہنے کا کبھی بہانہ بنا سکتا ہے؟ یعنی کبھی زندگی میں تم نے یہ سوچا کہ اولاد سے محبت میں بھی میں کوئی ایسا بہانہ گھڑ لوں کہ تھوڑی دیر کے لیے اس سے فارغ ہو جاؤں۔ کبھی تم نے کوئی ایسا حیلہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ دولت اور مال کی کشش میرے اندر کچھ وقفہ دے دے، کوئی ایسا راستا مل جائے کہ دولت اور مال کی کشش دو چار دن بعد آیا کرے۔ نہیں! کیوں نہیں؟ کیونکہ تم ان کے ساتھ تعلق میں سچے ہو۔ اور تم اللہ کے تعلق کو ساری عمر معطل اور بے تاثیر رکھنے میں کامیاب ہو۔ اس لیے کہ تمھیں اللہ سے کوئی تعلق دراصل ہے ہی نہیں۔ آدمی اپنے خود ساختہ بڑے بڑے تصورات سے احساسات کی سطح پر متاثر ہو جاتا ہے۔ اگر تم نے اللہ کو اس تصور کی طرح بھی نہیں رکھا جو کبھی کبھی ہمارے احساسات کو چھیڑ دیتا ہے تو تم نے اللہ سے کیا تعلق رکھا ہے؟! تمھیں قرآن شریف دیکھ کر فخر کا احساس ہوتا ہے؟ تمھیں قرآن شریف طاق پر رکھا دیکھ کر اللہ کی حضوری کا پیغام سنائی دیتا ہے؟ تمھیں نماز پڑھتے ہوئے اپنے آپ کا سر سے پاؤں تک بندہ ہونا محسوس ہوتا ہے؟ اب ہوش کرنا چاہیے۔ اب لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے اپنی شانِ بے نیازی کا اظہار کر رہا ہے کہ بھاڑ میں جاؤ، تم نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ تم میری کوئی ضرورت ہو! تم منافق، تم دغا باز، تم غدار، تم بھلا میری ضرورت ہو سکتے ہو! اب بھاڑ میں جاؤ۔ تو اگر اللہ تعالیٰ کے دستِ قہر کو تھپڑ کی طرح اپنے اوپر پڑنے سے بچانا ہو تو ابھی سے اپنی بندگی کو خالص کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمونے کے مطابق اپنے اندر کی دنیا اور اپنے باہر کی دنیا پر حتی المقدور نافذ رکھو۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس سوال کے جواب میں فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مجھے کوئی ایسا حرفِ آخر ارشاد فرما دیجیے یعنی مسلمان ہونے کی کوئی ایسی ذمہ داری مجھے بتا دیجیے کہ میں اسے سنوں اور اس پر پورا عمل کروں اور آپ کے بعد یعنی آپ کا یہ ارشاد سن کر مجھے کبھی یہ ضرورت نہ پڑے کہ میں کسی اور سے یہ سوال کروں۔ یعنی میرے اس سوال کا کامل اور حتمی اور قطعی اور آخری جواب آپ ارشاد فرما دیجیے کہ اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان لانا اور اس پر جم جانا۔ جم جانے کا مطلب ہے ہر حال میں اس پر ثابت قدم رہنا۔ وہ حال آزمائش کا ہو تو بھی ثابت قدم رہنا اور وہ حال آسانی اور آرام کا ہو تو بھی اس پر جمے رہنا۔ یعنی اپنے سارے وجود اور اس وجود کی تمام تفصیلات سے اللہ کی تصدیق کا ماحول پیدا کیے رکھنا، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ تو خدا کے لیے میں بھی توبہ کروں، آپ بھی توبہ کریں، میں بھی عزم کروں، آپ بھی عزم کریں۔ ہم اللہ کے ساتھ بہت زیادہ کھیل چکے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ لگتا ہے کہ ہمیں کوئی رخصت دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنے بدترین دشمنوں کے پاؤں میں روندنے کے لیے ڈال دے گا۔ جب سے ہمارا دورِ زوال شروع ہوا ہے ایک تقسیم عمل میں آئی ہے۔ زوال شروع ہونے کے ابتدائی آثار یہ تھے کہ مذہبی طبقہ نماز روزے میں چاق چوبند تھا، مخلص تھا لیکن لوگوں کی حاجت روائی نہیں کرتا تھا۔ اسے خالق کا خوف تو تھا، مخلوق کی محبت سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ہمارے زوال کی ابتدا ہے۔ اب مذہبی طبقے کا یہ حال ہے کہ مخلوق کو تو اس نے ہٹا دیا، خالق کے حقوق بھی اخلاص کے ساتھ، استغفار کے ساتھ، شوق کے ساتھ، خوف کے ساتھ پورے نہیں کر رہا۔ اب زوال مکمل ہو جائے گا۔ دوسری طرف جو ہیں انہوں نے کہا کہ مخلوق سے محبت ہے تو خالق کو الگ سے محبوب بنانے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے خالق کے نام کا تکلف بھی چھوڑ دیا۔ انہوں نے کہا کہ بس مقصدِ زندگی یہ ہے کہ سوشل ورک کرو۔ اب پوری امت اس میں دھنسی ہوئی ہے کہ جو لوگ اللہ کے سپاہی ہیں ان کے ہاتھ میں تلوار ابوجہل کی دی ہوئی ہے اور جو لوگ مخلوق کے خادم اور مخلوق کے

باتیں ہیں ان کی خدمتِ خلق کی لازمی شرط یہ بنتی جا رہی ہے کہ اللہ کا قولاً فعلاً حالاً انکار کرو۔ ہم اس میں پھنسے ہوئے ہیں تو اپنی ہی شامتِ اعمال سے پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر اس پر ہم اجتماعی توبہ کے آہنگ میں، رسول اللہ ﷺ کی وراثت میں چھوڑا ہوا عزم استقامت دوبارہ بحال نہیں کریں گے تو ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ جہنم کے کتوں کی خوراک بنا دے گا۔

پہلے کہا جاتا تھا کہ بازار میں اچھا ماحول نہیں ہوتا، مسجد میں اچھا ماحول ہوتا ہے۔ اب مسجد اور بازار دونوں میں اچھا ماحول نہیں ہوتا۔ تو کیا مطلب ہے، یہ کوئی اسلام نے سکھایا ہے کہ مسجد کا ماحول بھی بگاڑ لو۔ اپنی گردن چاہے جتنی زور سے پکڑو گے اس کی تکلیف بہرحال کم ہے، اس گرفت سے جو اللہ کے دستِ قہر کی ہوگی۔ اپنی گردن کو اپنے ہی پنجے سے دبا لو ورنہ پھر وہ ہاتھ تمہاری گردن پکڑے گا جس کا دباؤ تم برداشت نہیں کر سکو گے۔ بہرحال متوجہ اس طرف کرنا تھا کہ مسلمانوں کے کام آؤ، سب انسانوں کے کام آؤ۔ اسلام کی اپنی کردار سے حفاظت کرو کیونکہ ابھی ہماری علمی ترقی میں دیر ہے۔ فوری طور پر اسلام کی حفاظت اپنے کردار سے کرو اور فوری طور پر انسانوں کے ساتھ عاجزانہ خیرخواہی کا رویہ اختیار کرو۔ ورنہ تم زمین پر کالک کے دھبے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ سب انسانوں کے کام آؤ۔ اللہ نے اسلام کو فیضِ عام بنایا ہے۔ جو بھی اس دین کو ماننے والا ہوگا وہ ہر ایک کے لیے فیاض ہوگا۔ وہ مسلم، غیر مسلم، انسان، جانور، پیڑ پودے سب پر اللہ کی شفقت کا مظہر بن کر رہے گا۔ یہ دو فطری اصولِ بقا ہیں کہ اللہ سے جڑے رہو، وفاداری کے ساتھ، مخلوق سے متعلق رہو خیرخواہی کے ساتھ۔ یہ مسلمانوں کے لیے اجتماعی بقا کی واحد صورت ہے۔

اب آپ دیکھ لیجیے، 'اللہ سے جڑے رہو وفاداری کے ساتھ' یہ جملہ ہمارے لیے کتنا اجنبی اور جھوٹا ہو چکا ہے، اور مخلوق سے تعلق رکھو ایک عاجزانہ خیرخواہی کے ساتھ، یعنی ان

کے سرپرست نہ بنو، ان کے خادم بنو۔ اس شرطِ معاشرت کو پورا عالمِ اسلام کس درجے پر پورا کر رہا ہے؟ ہم دعوے دار ہیں غلبے کے، ہم دعوے دار ہیں فضیلت کے، ہم دعوے دار ہیں فوقیت کے اور ہم پورے عالمِ اسلام میں ایک محلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول معاشرت پر بنا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تو اللہ بنی اسرائیل کی طرح ہماری بھی خوش فہمیوں کا پردہ چاک کر سکتا ہے۔ بنی اسرائیل کو تو یہ بشارت دی تھی اللہ نے کہ ہم نے تمہیں ساری دنیا سے افضل کیا۔ اللہ نے ان کی حرکتوں پر وہ بشارت واپس لے لی اور انہیں افضل سے ارذل کر دیا۔

ایک طریقہ عرض کرتا ہوں اور خدا کرے ہم اس کو اپنا مسلسل عمل بنائیں۔ استغفار میں جی لگنا چاہیے۔ شکر میں دل کو نہال رہنا چاہیے۔ شکر اور استغفار کے لیے احساسات اور جذبات کی کمی نہ ہو۔ اللہ سے استغفار اس طرح کرو کہ اس کے دستِ بخشش کی تھپک محسوس کر لو اور اللہ کا شکر اس طرح کرو کہ گویا اللہ کو عطا کرتے ہوئے دیکھنے کے عمل سے گزر رہے ہو۔ شکر اور استغفار کو خالص کر کے اپنے احساسات میں داخل کرو اور دنیا میں دوسروں کو شریک رکھو۔ اپنی دنیا میں دوسروں کو شریک نہ رکھنے والا آخرت میں فلاح پانے کی قابلیت کھو بیٹھتا ہے، استحقاق کھو بیٹھتا ہے۔ دنیا میں دوسروں کو شریک رکھو۔ اپنے وسائل، اپنے اختیارات، ان سب کو دوسرے کے فائدے کے لیے استعمال کرو اور دوسروں کے فائدے کو اتنی اہمیت دینے کی کوشش کرو کہ کبھی کبھی اپنا نقصان خوشی سے گوارا کر لو۔ اس روٹی سے زیادہ لذیذ کوئی روٹی نہیں ہوتی جو میں خود بھوکا رہ کر آپ کو کھلا دیتا ہوں۔

یہ جو ماڈرن gadgets ہیں، موبائل فون وغیرہ، اِن کی طرف سے بہت محتاط اور ہوشیار رہنا چاہیے۔ یہ ہمیں dehumanize کر سکتے ہیں، بلکہ کر رہے ہیں۔ ان سے اپنی تنہائی کی بھی حفاظت کرو اور اپنی مجلس میں بھی انہیں در اندازی نہ کرنے دو۔ یہ سب

وہم ہے کہ آپ نیٹ سے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ علم آدمی استاد سے حاصل کرتا ہے۔ ایسی معلومات جن کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار میرے پاس نہیں ہے، وہ معلومات جہلِ مرکب ہیں، یعنی compound ignorance اس جہالت کو کہتے ہیں جس کے بارے میں اس جہالت میں مبتلا شخص کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ یہ علم ہے۔ اپنی تنہائی کی حفاظت کرو، اپنی معاشرت کی حفاظت کرو۔ ایک موبائل فون تمہاری تنہائی کو غارت کر رہا ہے، تمہاری معاشرت کو تباہ کر رہا ہے۔ یعنی چار آدمی بیٹھے ہیں اور وہ چاروں بے وقوف موبائل پر لگے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے دوست ہیں۔ مطلب یہ کبھی ہوسکتا ہے کہ باپ بیٹھا ہو اور بیٹا اس کے سامنے موبائل پر کھیل رہا ہو۔ یہ کبھی ہوسکتا ہے کہ استاد بیٹھا ہو اور شاگرد کا ایک دھیان اپنے فون کی اسکرین پر ہو کہ اس نے جبراً اپنے استاد کی وجہ سے اس سائلنٹ تو کر دیا لیکن اس کی طرف توجہ کو اور بڑھا دیا۔ تو کسی کی بدترین توہین ہے کہ آپ اس سے ملاقات کریں اور اس دوران میں آپ اپنے فون کی طرف متوجہ رہیں۔ چھوٹا ہو یا بڑا، یہ اس کی توہین ہے۔ اب یہ مسجدوں میں ہوتا ہے، حرم میں ہوتا ہے، حرمین میں ہوتا ہے۔ میرے زیادہ ملاقاتی تو میرے چھوٹے ہیں۔ عمر میں چھوٹے ہیں، شاگرد ہیں۔ میں کبھی کسی مجلس میں فون آن نہیں رکھتا، یعنی دانستہ نہیں رکھتا۔ میں اس کو اکرام کے خلاف سمجھتا ہوں اور مسلمان کا اکرام کرنا واجب ہے۔ اس کے لیے نفل کو توڑا جا سکتا ہے۔ تو آپ ایک اتنی سی چیز سے مسلمانوں کی مسلسل توہین کیے جا رہے ہیں۔ اور پھر عجیب عجیب طرح کی چیزیں ہیں کہ وہ ایک مرتبہ کھل جائیں تو تین گھنٹے بعد خیال آتا ہے کہ یہ تین گھنٹے تین منٹ میں گزر گئے۔ ارے! تم نے اسکرین پر تین گھنٹے گویا تین منٹ میں گزار لیے، تمہیں کبھی کسی ذکر، کسی تلاوت، کسی نماز میں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔

اور تیسرا کام یہ کہ روز توبہ کیا کرو دل لگا کر، کیونکہ توبہ اللہ کو خوش کرنے کا shortest cut ہے۔ توبہ جس کو کرنی آتی ہے وہ اللہ کو بھی خوش رکھتا ہے، پھر اس کے جواب میں، اس کے صلے میں اللہ اسے خوش رکھتا ہے۔ توبہ سے حاصل ہونے والا اطمینان دنیا کی کسی بھی نیکی سے میسر نہیں آسکتا۔ توبہ سے دل جس طرح شانت ہو جاتا ہے، دل جس طرح جنت کے جھونکے کا لمس محسوس کر لیتا ہے، ویسا کوئی عمل نہیں ہے۔ توبہ میں سنجیدہ ہو جاؤ، لوگوں کے کام آنے والے بنو، اللہ کے کام میں کھپنے والے بنو۔ ان بنیادوں پر قدم رکھو گے تو یہ مقناطیس ہیں، یہ تمہارے قدم ہلنے نہیں دیں گے۔ میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے گزشتہ دس پندرہ برس میں شاید ہی کوئی شخص ایسا دیکھا ہو، کوئی بھی، جس کے بارے میں مجھے یہ احساس ہو کہ یہ اللہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب آپ بتائیے کہ یہ اسلام، ایمان، دین، سنت، اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کا مشترکہ مطالبہ اور واحد شرط ہے کہ نہیں کہ تم اپنے آپ کو سب سے پہلے ایسا بناؤ کہ تم یہ کہہ سکو اور ہم یہ مان لیں کہ تم ہمارے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ یہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں موبائل کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں پیسے کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں 'برینڈڈ' چیزیں پہنے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن یہ کہنے والا کہاں ہے کہ میں اللہ کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جڑے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ویسے دعوے کرتے رہو۔ دیکھا ہے ناں کہ حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلم تہذیب کا سب سے بڑا حال ہے، تو حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ملاوٹ اور جھوٹ آنے کے نتیجے میں وہ گویا دل سے کوچ کر کے چیزوں اور رسموں میں منتقل ہو گیا ہے۔ چونکہ جھوٹے جذبے کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنا مشکل ہوتا ہے تو یہ جھوٹا جذبہ محبت، یہ جھوٹا دعوائے محبت کچھ ہی عرصے میں اتنا زیادہ گھناؤنا ہو گیا کہ اب اظہارِ محبت ممکن ہی نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو توڑے بغیر۔ اب اداکاروں کی مدد سے اظہارِ محبت ہو رہا ہے۔ بالکل بے پردہ ماڈلز کی رہنمائی میں محبت کا کاروان چلایا جا رہا ہے۔ تو اللہ تمہیں دکھا نہیں رہا کہ

تم اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔ ٹی وی وغیرہ پر سارا رمضان کئی برسوں سے جس طرح کے رمضان شوز چلتے ہیں، یعنی ننانوے فی صد اکثریت کے ساتھ، اسے دیکھ کے یہ نہیں لگتا کہ ابلیس چھوٹا شیطان ہے، آدمی بڑا شیطان ہے!

دوسرا، ہماری مسلم معاشرت یہ تھی کہ اذان کی آواز آتے ہی گویا کائنات پر سکتہ چھا جاتا تھا۔ اب اذان ہو رہی ہے، وہ شخص جو پانچ وقت کا نمازی ہے وہ بھی اپنی کاروباری یا فضول گفتگو کو روکنا گوارا نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً نماز کی تیاری کی طرف متوجہ ہونا تو دور کی بات ہے، اذان کا جواب دینا جو بہت ضروری ہے، اُس کی طرف سے غافل ہے۔ تو جو شخص اذان سے غافل ہے وہ نماز پر مائل ہوسکتا ہے؟ اذان یا تو 'الارم' ہے یا زلزلہ ہے، ان دو کے سوا اس کو محسوس کرنے کا کوئی تیسرا زاویہ ہے ہی نہیں۔ اذان یا تو میری غفلت کے ماحول میں زلزلے کی طرح آتی ہے اور مجھے بیدار کرتی ہے یا الارم کی طرح گونجتی ہے کہ بس اب بہت ہو چکا، اللہ کی طرف چلو۔

مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیگم دین داری میں شاید ان سے بھی زیادہ تھیں۔ سخاوت میں وہ حاتمِ وقت تھیں۔ ان کے ایک ہی صاحب زادے تھے، حافظ محمد احمد صاحب۔ اب آپ سوچیں کہ ایک ہی بچہ ہے، نہ کوئی دوسری بچی نہ بچہ، تو حافظ محمد احمد صاحب نے لکھا ہے کہ میری والدہ مجھے بہت چاہتی تھیں اور زیادہ تر میں ان کی گود میں رہتا تھا، لیکن جیسے ہی اذان سنائی دیتی تھی وہ مجھے ایک طرف بالکل لاتعلقی سے اجنبی بن کر بٹھا دیتیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان سے میرا کوئی تعلق کیا، شناسائی بھی نہیں ہے۔ یہ اذان ہے۔ اسی طرح وضو کے کتنے آداب تھے۔ لوگوں کو، اپنے بڑوں کو آپ نے وضو کرتے دیکھا ہوگا، وضو کے کتنے آداب تھے، کتنی حالتِ حضوری میں دنیا کے زہد کے ساتھ وضو کیا جاتا تھا۔ وضو سے دو چیزیں ظاہر ہوتی ہیں: ایک اللہ کی حضوری، اور دوسرے دنیا کا زہد۔ وہ وضو دیکھنے سے نماز کی کشش پیدا ہو جاتی تھی اور جو آدمی اس طرح

وضو کرتا تھا اس کی نماز کیسی ہوگی! اب نہ نماز کا احترام، نہ وضو کا اہتمام۔ آپ خانۂ کعبہ کی مسجد میں بھی چلے جایئے تو وہاں وضو اپنی مسنون صورت میں نظر نہیں آتا۔ اب کتنے لوگ ہیں جو وضو کو اس کی مسنون صورت میں کرنے کا اہتمام رکھتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی انہیں لرزا دیتی ہے۔ نماز اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق کی بہت بڑی کسوٹی ہے۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ ہمارا تعلق باللہ سچا ہے یا نہیں۔ اِس عظیم ترین عمل کی یہ دو بنیادیں ہیں، اذان اور وضو۔ اِن دونوں کا ہم نے یہ حشر کر رکھا ہے کہ وضو صرف ہاتھ پاؤں دھونا رہ گیا ہے، اور وہ بھی اسراف، بے پروائی اور غفلت کے ساتھ۔ اذان سننے اور اس کا جواب دینے کی روایت اتنی کمزور پڑ گئی ہے کہ علما کی مجلس میں بھی اِس کا رواج کم رہ گیا ہے۔ جو بے چارہ اذان کا جواب دینے کا عادی ہے، وہ اِن مجلسوں میں چھپ چھپا کر اذان کا جواب دیتا ہے۔ اسے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ بھائی، یہ بہت بڑا بحران ہے، یہ بہت بڑی مشکل ہے۔ جو اللہ کو ماننے والا ہے، وہ خود کو اور اپنے فوری ماحول کو اس غلبے سے، اس بحران سے نکلنے کی کوشش میں خرچ کر دے گا اور جو اللہ کو نہیں مانتا وہ تماش بینوں کی طرح دیکھتا رہے گا۔ اب لوگ مشورہ بھی اس طرح کرتے ہیں کہ فرض کیا، ایک شاگرد اپنے استاد کے پاس، ایک مرید اپنے شیخ کے پاس پہنچا ہے تو وہ اپنی قابلِ اصلاح خامی کا بھی ذکر اس طرح کرے گا کہ گویا اسے شاباش دی جائے۔ تو جہاں یہ نفسیاتی ساخت بن چکی ہے، اس ردی سامان پر تم دین کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہو! خود کو دلدل بنا کر دین کے معمار بننا چاہتے ہو!

اور دوسری تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آج پڑھی جانے والی دوسری حدیث میں یہ ارشاد فرمائی ہے کہ دین میں اعتدال اختیار کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی دین داری اپنے ذمے نہ لے لو جسے نبھایا نہ جا سکے اور اتنے نیک بھی نہ بن جاؤ کہ برائی کو مٹانے کی بجائے تم بروں کا خاتمہ کرنے لگو۔ پھر یہ کہ جو آدمی دین میں میانہ روی برتتا ہے، اعتدال

نفس میں پیدا ہو جانے والے سب سے بڑے بگاڑ سے ان شاء اللہ محفوظ رہتا ہے، وہ بگاڑ ہے تکبر۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ بہت زیادہ دین، دین کرتے ہیں، ان میں ایک خود پسندی اور خود نمائی اور تکبر سے ملتی جلتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نصیحتِ مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تکبر سے بچنا ہے، اگر لوگوں کی بد خواہی سے بچنا ہے تو اپنے اعمال کو اعتدال کے ساتھ انجام دو۔

جمعۃ المبارک، 21 جولائی 2017

صبر اور سچائی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ

انسان ایک اخلاقی وجود ہے۔ اخلاق، فطرت اور شریعت کی ہم اصلی اور ہم آہنگی سے وجود میں آتے ہیں۔ انسان چونکہ اخلاقی وجود ہے، اسی لیے خیر وشر کی کشاکش کے ماحول میں اتارا گیا ہے اور اپنے اعمال پر جواب دہ ہے۔ عملِ صالح، انسان کے اخلاقی وجود ہونے کی سند ہے اور ایمان یہ بتاتا ہے کہ ہم ایک عقلی وجود بھی ہیں۔ اخلاق کی وہی تین بنیادیں ہیں جو شخصیت کی ہیں، یعنی ذہن، طبیعت اور ارادہ۔ تاہم اخلاق کا اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی دوسرے کی مراد پر ڈھلنے کی کوشش کریں۔ یہ وہ دوسرا ہے جو ہمارا حاکم ہے، جو ہمارا خالق ہے، جو ہمارا معبود ہے اور جس کے ہاتھ میں ہمارا وہ حساب کتاب بھی ہے جس کے نتیجے میں ہمیں ابدی راحت یا تکلیف نصیب ہوگی۔ اخلاق کا مطلب بھی یہ ہے کہ کسی مسلمہ ہستی کی مراد، مرضی اور حکم کے تابع رہنا۔ اسی سے اخلاقی وجود عمل میں آتا ہے۔ اگر کوئی اتھارٹی موجود نہ ہو تو اخلاقی وجود پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ اصولی بات ہے۔ اخلاق کے لیے اللہ کا ہونا ایک لازمی شرط ہے۔ جو شخص اپنے حاکم، اپنے مالک، اپنے رب، اپنے معبود کو نہیں پہچانتا، اور اسے پہچان کر بندگی کی مستقل

پوزیشن نہیں لیتا تو اس شخص کا اخلاقی وجود خلا میں ہے اور اس کے اعمال، خیر سے ظاہری مشابہت رکھنے کے باوجود خیر کی اصل سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض چیزوں کی صورت تو اچھی ہوتی ہے لیکن وہ اچھائی کی روح سے خالی ہوتی ہیں۔ تو اخلاقی وجود کی پہچان اور تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اخلاق کی بنیاد اور اخلاقی حسنات کی ماہیت اور غایت ایمان سے متعین ہو اور بندگی کے مادے سے وجود میں آئے۔ اخلاق کا محض انسانی ہونا کافی نہیں تاوقتیکہ بندگی کی اصل پر استوار ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ بندگی انسانیت پر مقدم ہے۔ انسان کے اندر جو چیز بندگی کی اصل سے نہیں پھوٹی، جو اچھی بات بھی عبدیت کی اساس پر استوار اور بندگی کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے، وہ خلا میں بننے والی صورت ہے جو بس دیکھنے میں اچھی لگ سکتی ہے، اس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے اپنے احکام پر اور اپنی واضح مرضیات پر منحصر کر کے ہمیں اپنی آخرت یعنی اپنے وجود کی ابدی جہت کو بہتر بنانے اور اپنی خواہش کے مطابق رکھنے کا موقع عنایت فرمایا۔

ابھی اخلاق اور شخصیت کی مشترک بنیادوں کی طرف اشارہ کیا تھا، اُس کی کچھ ضروری تفصیل کر لیتے ہیں۔ اخلاق کا منبع تو ایک ہی ہے، یعنی نفس، تاہم اس کی کچھ قسمیں بھی ہیں۔ بعض کا تعلق ارادے سے ہے، کچھ کا طبیعت سے اور چند کا ذہن سے۔ وہ اخلاق جن کی صورت عملی ہے اور جن کی نسبت ارادے سے ہے، یعنی وہ وصف جو اپنی حتمی صورت میں عمل کی طرح ہو اُس کا تعلق ارادے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح جو وصف خیال کی طرح ہو اُس کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے، اور جو وصف رغبت اور کراہت کے پہلو رکھتا ہو اُس کا تعلق طبیعت سے ہوتا ہے۔ ویسے تو اخلاق کی تمام قسمیں عمل میں بھی ڈھلتی ہیں اور کسی نا کسی زاویے سے ذہنی اور طبعی بھی ہوتی ہیں، تاہم اس وقت اخلاق کی قدرے مفصل تفہیم کے لیے ان کی اقسام بندی کی ہے جو ظاہر ہے کہ کلی اور حتمی نہیں ہے۔

اس ضروری وضاحت کے ساتھ اب یہ کہنا ہے کہ اخلاق کا وہ حصہ جو ارادی اور عملی ہے اُس کی بنیاد دو اوصاف پر ہے جن کا تعلق ذہن، طبیعت اور ارادے تینوں سے ہے۔ اگر یہ دو اوصاف مستحکم ہو جائیں تو پھر ارادی اور عملی اخلاق میں سہولت اور استقامت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کا معیار بھی بلند ہو جاتا ہے۔ وہ دو اوصاف ہیں: سچائی اور صبر۔ یہاں سچائی کا مطلب ہے عملی سچائی، یعنی سچ بولنا۔ یہ دونوں اوصاف اگر ہمارا محاورہ بن جائیں، ہماری عادت بن جائیں تو باقی اخلاقی اعمال بھی آسان ہو جاتے ہیں اور انہیں بے تکلفی سے نبھانا بھی سہل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ خیال رہے کہ اخلاقی حسنات اگر ارادے سے ایک موجبِ عمل تعلق نہ رکھیں تو اخلاق کی ذہنی اور طبعی نسبتیں بے کار ہیں۔ یعنی کہ جب تک اخلاق عمل نہیں پیدا کرے گا، اس وقت تک وہ محض تصور یا صرف جذبے کی حیثیت سے بے تاثیر اور بے مصرف ہے۔ ارادے کی اہمیت یہ ہے کہ ذہن کے مسلّمات اور طبیعت کے مرغوبات کو عمل میں لا کر دکھا دیتا ہے تاکہ شخصیت میں تضاد اور دوہرا پن نہ پیدا ہو۔ وہ آدمی دوہری شخصیت کا مریض ہے جس کی مانی ہوئی بات عمل میں نہ ڈھلے۔ اگر اخلاق عمل کی صورت اختیار نہیں کرتا اور محض دل میں کچھ جذبات اور ذہن میں کچھ تصورات کی صورت میں موجود ہے تو ناقابلِ اعتبار ہے۔ میرے اخلاقی تصورات اور جذبات دراصل بندگی کو صادق اور کامل بنانے کے لیے ہیں۔ اور بندگی کے لفظ ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں ارادے کا کردار مرکزی ہے اور یہ قلب و ذہن کی تسلیم سے شروع ہوتی ہے اور تعمیل پر مکمل ہوتی ہے۔

اب حسبِ معمول کچھ احادیثِ مبارکہ کا مطالعہ کر لیتے ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((يَقُولُ اللهُ تَعَالَى: مَا لِعَبْدِي الْمُؤْمِنِ عِنْدِي جَزَاءٌ، إِذَا

تَبَضْتُ صَفِيَّهُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهُ، إِلَّا الْجَنَّةُ)) رواه البخاری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے بندۂ مومن کی کوئی دنیاوی مرغوب چیز لے لوں اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کے لیے میرے پاس جنت کے سوا کوئی اور بدلہ نہیں ہے۔ (بخاری)

عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْكِي نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ ضَرَبَهُ قَوْمُهُ، وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهِ، وَيَقُولُ: ((رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ))
سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کا تذکرہ فرماتے ہوئے فرما رہے تھے:
ان کی قوم نے ان کو مارا اور لہولہان کر دیا اور وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں: اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما دے کیونکہ یہ ناواقف ہیں، جانتے نہیں ہیں۔ (متفق علیہ)

عَنْ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يَكُونَ صِدِّيقًا))
سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
سچ بھلائی اور نیکوکاری کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی اور بھلائی جنت کی

راہ پر لے جاتی ہے، اور آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو صدیق لکھ لیا جاتا ہے۔ (متفق علیہ)

صابر آدمی دراصل وفادار آدمی ہوتا ہے۔ صبر، وفاداری ہے خصوصاً حالتِ تکلیف میں۔ تکلیف اور وفاداری میں لازمی تعلق ہے۔ میں خود کو وفادار بندہ سمجھتا ہوں مگر مجھے اپنی وفاداری کا یقین مشقت اور تکلیف سے گزر کر ہی میسر آئے گا۔ اللہ کے ساتھ میرا تعلق آزمائش اور مصیبت میں بھی اپنی مخصوص اور معیاری کیفیات کے ساتھ برقرار رہتا ہے تو پھر میں صابر ہوں، یعنی اللہ کا وفادار بندہ ہوں۔ اسی لیے صبر میں ایک چھپا ہوا تشکر بھی ہوتا ہے۔ صابر آدمی صبر اور شکر کے درمیان موجود لغوی فرق کو اپنے احوال میں باقی نہیں رہنے دیتا اور عین حالتِ صبر میں شکر گزاری کی کیفیت بھی محسوس کرتا ہے۔

صبر اور شکر میں تعلق کی ایک ہی بات کو طرح طرح سے دہرا کر کہنے میں اس وقت لطف بھی آرہا ہے اور پھر یہ خیال بھی ہے کہ قلب وطبیعت سے مناسبت رکھنے والے کسی امر کا بیان ایک تنوع رکھنے والی تکرار کے ساتھ کیا جائے تو اُس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ اور ویسے بھی لفظ کی تکرار ناگوار ہوسکتی ہے لیکن ایک ہی معنی کا مختلف لفظوں میں اظہار خوش گوار ہوتا ہے۔ تو اگر صبر اور شکر کے جوڑ کو معنی اور مضمون میں اضافہ کیے بغیر بار بار دہرا کر عرض کروں تو اس تکرار کی اجازت ہونی چاہیے۔ تو اب یوں دیکھیں، یعنی اس منظر کو ایک اور کھڑکی سے مشاہدہ کریں کہ اللہ سے تعلق کے دو تقاضے ہیں: راحت میں شکر گزاری اور تکلیف میں صبر۔ راحت میں شکر گزاری تو صبر کی کیفیت سے الگ ہوسکتی ہے لیکن صبر کی حالت میں جو شخص شکر گزاری کے جذبے یا مخصوص کیفیات کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے اس نے گویا صبر کو اس کی روح کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لیا۔ جن موقعوں پر آدمی بندگی کے موقف پر عملاً اور حالاً کمزور پڑ سکتا ہے، اُن میں اگر کوئی آدمی اللہ کا شکر گزار

بندہ ہونا qualify کر سکے تو اصل میں صابر یہ ہے۔ یعنی صبر اپنی نفسیاتی اور قلبی ساخت میں شکر سے ایک گہری مناسبت رکھتا ہے۔ اس سطح کا صبر کمالِ بندگی ہے اور مقصودِ بندگی ہے کیونکہ اللہ سے کوئی تعلق تشکر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ صبر بھی تعلق باللہ ہی ہے، یہ بھی شکر گزاری سے خالی نہیں ہوتا۔ تو صبر ایک ایسا وصف ہے جس کو حاصل کیے بغیر خود کو اللہ کا بندہ سمجھنا بے معنی ہے۔ ایسے بنیادی وصف کو اس کی حالتِ کمال میں کی گئی تعریف کے ساتھ ذہن میں رکھنا اس اعتبار سے بھی بہت مفید ہے کہ اگر ہم کامل معنی کو اپنا مقصود بنائیں گے تو ان شاء اللہ اس کے قریب قریب لے جانی والی جد و جہد ضرور کریں گے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کچھ ایسی چیزیں اپنے اندر ضرور پیدا کرلیں گے جو چاہے ہمیں اس کامل معنی کا پورا حامل نہ بنائیں لیکن اس سے سچی نسبت رکھنے والا بندہ ضرور بنا دیں گی۔ چیزوں کو ان کی آئڈیل definition کے ساتھ محفوظ نہ رکھنے سے ان چیزوں کی ناقدری ہوتی ہے، اور اگر چیزوں کی مثالی تعریف سامنے ہو تو ان کے حصول کی سنجیدہ کوشش کرنے والا اپنے حاصلات پر گھمنڈ نہیں کرتا۔ یہ آئڈیل اور کلی تعریف اسے باور کرواتی رہتی ہے کہ تم راستے پر تو ہو لیکن منزل سے ابھی دور ہو۔ تو بھائی، صبر کی مثالی تعریف یہ ہے کہ جواز روئے حال منافیِ شکر نہ ہو۔ اس کے لیے نفس میں بندگی کے داعیے کا غلبہ ضروری ہے۔ یعنی نفس میں بندگی کی حالت غالب آئے گی تو تعلق مع اللہ سے نسبت رکھنے والے احوال نصیب ہوں گے۔ آدمی بندگی کی قوت سے نفس پر گرفت رکھنے کی یہ توفیق اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا جب تک وہ سچ پر مضبوطی کے ساتھ قائم نہ ہو جائے۔ سچ کا اصل کردار تو یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے مغلوب نہیں ہونے دیتا اور اللہ کی طرف یکسو رکھتا ہے۔ لیکن ہم اگر سچ کا مطلب صرف سچ بولنا رکھیں تو بھی اس عمل پر استقامت سے نفس پر اصلاحی قدرت حاصل ہوسکتی ہے۔ تو سب سے پہلے یہ عزم کر لینا چاہیے کہ میری زبان کو مرتے دم تک جھوٹ کے ذائقے سے محفوظ رہنا ہے اور میرے دل

کو دروغ گوئی کے ارادے سے بھی پاک رہنا ہے۔ سچ بولنے کی عادت کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ ہمارا بولا ہوا ایک ایک لفظ ہماری تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔ سچ اگر تکلف سے اور خود پر جبر کر کے بھی بولا جائے تو بھی اس کی تاثیر سے نفس کی امّارگی، دنیا کی محبت اور ریا کے خاتمے کی راہ کھل جاتی ہے۔ سچ بولنا ایک طرح سے اللہ کی حضوری میں رکھنے والا فعل ہے۔ سچ کا صبر سے تعلق یہ ہے کہ صبر اللہ سے تعلق میں سچا بناتا ہے، اور اللہ کے حکم کی تعمیل میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ یعنی صبر کہتا ہے کہ دنیا چاہے جہنم بن جائے، یہ مجھے آپ کے تعلق کی جنت سے نہیں نکال سکتی۔ اور سچ کہتا ہے کہ دنیا خواہ کتنی پرکشش ہو جائے، یہ اللہ کی فرمانبرداری کے جذبے کو سرد نہیں کر سکتی۔ دونوں کا حاصل یہ ہے کہ میرا اور میری دنیا کا تعلق اللہ کے ساتھ میرے تعلق کے ماتحت رہے۔ صبر برے حالات میں بھی اللہ سے متعلق رکھتا ہے اور سچ دنیا کی چمک دمک اور فائدے نقصان کو اللہ کی فرمان برداری پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ ان دونوں اوصاف کا مشترک مادہ وفاداری ہے، اللہ سے وفاداری، اُس کے احکام سے وفاداری، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفاداری وغیرہ۔ افسوس اس وفاداری کا ہی ہم میں تقریباً فقدان رہا ہے۔ ہم اللہ کے لیے تکلیف اٹھانے کے تصور سے بھی ڈرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ سوچ ہمارے لیے ایک ناگوار سوچ بن گئی ہے کہ اللہ سے تعلق نبھانے کے لیے آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، نقصان اٹھانے پڑتے ہیں، اپنی محبوب چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے اور راحتوں سے منہ پھیر کر تکلیفوں کو دعوت دینی پڑتی ہے۔ یعنی ان سب کا امکان ہے۔ یہ سارے تصورات ایمانی ذہن رکھنے والے لوگوں کے لیے بھی نامانوس بلکہ وحشت انگیز ہو چکے ہیں۔ اللہ کے لیے قربانی دینے کا تصور اتنا ڈراؤنا بن چکا ہے کہ اس سے خود کو بچانے کے لیے ایک خیالی خدا بنانے کی مہم شروع ہو چکی ہے۔ حقیقی خدا سے بچنے کی مسلسل تگ و دو کی وجہ سے ہماری زندگی اور ہماری خواہشات کے بہت ہی تھوڑے حصے پر تعلق باللہ کی روشنی پڑ رہی ہو تو پڑ رہی

ہو، بیشتر حصے اس تعلق کی حرارت اور روشنی سے محروم ہیں۔ اگر ہمیں اپنے موجودہ بحران اور تنزل کا مجبوراً کوئی ایک سبب بتانا ہو تو وہ سبب یہ ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ وفادار رہنے کی روایت، جذبے اور تخیل سے دور ہو گئے ہیں۔ ہم نے اپنے اندر مذہبیت کا ایک ایسا نظام پیدا کر لیا ہے جو اللہ کے لیے قربانی دینے کے عاجزانہ اور والہانہ جذبے سے خالی ہے۔ تو بھائی، اب ہمارے پیشِ نظر یہی مقصد ہونا چاہیے کہ کسی بھی طرح بے وفائی کے زہریلے دھویں سے باہر نکلنا ہے۔ پورا عالمِ اسلام ایک بڑا مردہ خانہ بن کے رہ گیا ہے اور اس سے نکلنے کی کوئی تدبیر بھی سمجھ نہیں آتی۔ اب تو بس یہی ہے کہ اللہ ہماری توبہ قبول کر لے، ہماری بے وفائیاں معاف کر دے اور اپنے دستِ قدرت ورحمت سے اس بھونچال اور اس بھنور سے ہمیں باہر نکال دے۔ اگر اسے تدبیر سمجھو تو یہی تدبیر ہے کہ رات سجدۂ استغفار میں گزارو اور دن کلمۂ استغفار میں بسر کرو۔ غضب خدا کا، ہم وہ ہیں جنھوں نے دانستہ اللہ سے بے وفائی کی، ہم وہ ہیں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے تعلق کی اتنی قدر بھی نہیں کی جتنی اولاد کے ساتھ اور مال کے ساتھ تعلق کی کرتے ہیں۔ ہماری زندگیاں ایسے کسی تجربے سے خالی ہیں جسے صبر کا نام دیا جا سکے، اور ہمارا تمام نظامِ گفتار وکردار سچ کے مرکز سے محروم ہے۔ اس سے بڑا بحران کوئی ہو سکتا ہے کہ باطن صبر سے خالی ہے اور عمل سچ سے عاری۔ یہ باتیں میں صرف آپ کو نہیں سنا رہا بلکہ آئینہ سامنے رکھ کر عرض کر رہا ہوں۔

ہم نے ابھی جو دو اوصاف بیان کیے ہیں اُن کا تعلق عمل سے زیادہ ہے، اس لیے انھیں اپنے اندر پیدا کرنا نسبتاً آسان ہے۔ یعنی قلب میں حال پیدا کرنا مشکل ہے، ذہن میں خیال پیدا کرنا دشوار ہے لیکن ارادے سے عمل پیدا کرنا ہر شخص کے لیے آسان ہے۔ ان معنوں میں صبر اور سچائی ارادی اخلاق ہیں اور انھیں حاصل کرنا ہر آدمی کے لیے سہل ہے۔ اللہ توفیق دے۔

تو جناب، صابر وہ ہے جو کسی بھی حال میں اللہ سے اپنے تشکرانہ تعلق کو مسلسل اضافے کی حالت میں برقرار رکھے، اور سچ بولنے والا بندہ وہ ہے جو دنیا کو حق پر ترجیح نہ دے اور آخرت سے غافل نہ رہے۔ ویسے ہر اچھائی میں یہ برکت ہوتی ہے کہ وہ دوسری تمام اچھائیوں کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اچھائی کی اسی تاثیر کو دیکھتے ہوئے کم از کم میں تو اپنے لیے عمل کا جو طریقہ اور مزاج تجویز کروں گا وہ یہی ہوگا کہ استغفار کرو، جو بھی خوبی اور بھلائی سامنے آئے اس سے چمٹ جاؤ اور اسے اپنے لیے سفینۂ نوح بنالو۔ قرآن کی ہر ہدایت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہر سنت سفینۂ نوح ہے۔ امت کا زیادہ تر حصہ سیدنا نوح علیہ السلام کے بیٹے کی طرح اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ ہم تو پہاڑ پر چڑھ جائیں گے، وہاں طوفان کہاں سے پہنچے گا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے یہ طرزِ عمل بہت عرصے سے اختیار کر رکھا ہے کہ ہمیں، نعوذ باللہ، کتاب وسنت کی ندائے نجات سننے کی کیا ضرورت ہے، دنیا میں کامیابی کی اتنی سیڑھیاں ہیں کہ کسی بھی سیڑھی پر چڑھ جائیں گے تو ہم نجات وغیرہ سب پالیں گے۔ تو ہم نے دنیا میں کامیابی کو نجات کا متبادل بنا رکھا ہے اور دنیا کی تکلیفوں کو عذاب کا مرادف سمجھ رکھا ہے۔ یعنی دنیا پاس ہے تو ہم جنت میں ہیں اور دنیا پاس نہیں ہے تو ہم دوزخ میں ہیں۔ اس ہول ناک صورتِ حال میں گھرے ہوئے بے بس آدمی کی طرح پکار کر کہہ رہا ہوں کہ لوگو! وقت بہت کم ہے، پتا نہیں اگلا سانس آتا ہے کہ نہیں، تو جلدی کرو، استغفار کو کشتیِ نوحؑ بنا لو اور یہ صبر، سچائی یا جو بھی بھلائیاں سمجھ میں آرہی ہیں یہ سب اس کشتی میں رکھا ہوا زادِ سفر ہے، ان کو اختیار کرو، انہیں استعمال میں لاؤ ورنہ تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ ربِّ جلیل ہم ایسے بے وفاؤں کو اپنے دین کی ترجمانی کے منصب پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ ہمیں مٹا کر اس دین کے لیے کوئی دوسری امت لے آئے گا۔ اللہ وہ وقت نہ دکھائے اور ہمیں مقبول توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تو اب ہم سب مل کر اپنی زندگی کا یہ مقصد بنائیں کہ اپنے اندر اور باہر کے یخ بستہ اندھیروں کو روشن اور پر حرارت کرنے کے لیے ایک بڑا الاؤ روشن کرنا ہے۔ میں بھی یہ ساری باتیں اسی لیے کر رہا ہوں کہ الاؤ کے واسطے ایندھن اکٹھا ہو جائے۔ اس کام کے لیے ساری زندگی لکڑیاں جمع کرنے میں گزر جائے تو یہ گھاٹے کا سودا نہ ہوگا۔ استغفار کا جذبہ پیدا کرو۔ اللہ سے بے وفائیوں پر توبہ کرو پھر اس کے قرب کے مقام پر آکر اس کی پسندیدہ چیزوں کو اختیار کرنے کا عمل شروع کرو۔ یہی نجات کا راستا ہے جس پر ہم میں سے ایک ایک کو چلنا پڑے گا اور یہی وہ رسی ہے جسے پکڑ کر ہم اس دلدل سے نکل سکتے ہیں۔

الحمد للہ، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہیں۔ یہ نسبت ہماری بہت سی کمزوریوں اور نالائقیوں کو ان شاء اللہ ڈھانپ لے گی۔ مگر ہم میں بھی اتنی غیرت تو ہونی چاہیے کہ اپنا جائزہ لے سکیں کہ ہم امتی کہلانے کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ تو سچی بات یہی ہے کہ ہم بھلا کہاں کے امتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسندیدہ آدمی کہاں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسندیدہ معاشرہ کہاں ہے؟ پسندیدہ ریاست کہاں ہے؟ یہ تو خیر سے بہت بڑے مطالبات ہیں، ہم تو روئے ارض پر اپنا ایک محلہ بھی نہیں دکھا سکتے جسے دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ دیکھو، یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں کا محلہ۔ ارے، حرم کے مطاف میں کھڑے ہو کر بھی یہ دعوا نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے طواف کر رہے ہیں! ایسے گھرے اور ہمہ گیر بحران کو بھی محسوس نہ کرنا پرلے درجے کی سنگ دلی اور بے حسی ہے اور اس سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا خودکشی ہے۔ تو بھائی، میں آپ کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ آج سے بلکہ ابھی سے اللہ کا وفادار بندہ بننے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور ہمیشہ سچ بولوں گا۔ اللہ مجھے اس عہد پر ثابت قدم رکھے اور صبر وصداقت کو میرا شعار بنائے۔ آپ بھی یہ عہد کیجیے اور پھر دوسروں کو بھی یہ بتائیے کہ نفس کے احوال پر قابو پانا ہے تو صبر کو اختیار کرو اور نفس کے افعال پر حاوی رہنا ہے تو سچ بولا کرو۔ یہ تزکیۂ نفس کے دو بازو ہیں۔ ظاہر

ہے جس چیز کو اللہ نے پسند فرمایا ہو اس کی حکمتیں اور اس کے حقائق ساری مخلوق کے مجموعی علم وفہم سے بھی زیادہ ہوں گے۔ ہم تو بس اپنی اوقات کے مطابق اور اپنے مفاد کے حساب سے معانی اخذ کرتے ہیں۔ اور مجرب بات ہے کہ ایک دن سچ بولنے کی پابندی نبھالیں تو لگتا ہے کہ کندھوں پر سے نفس کا بوجھ کم ہوگیا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ صبر کو اس کے بہترین مقاصد کے ساتھ اختیار کر کے دیکھیں تو ایسا لگے گا کہ نفس کے اندر کی تاریکی چھٹ گئی ہے۔ لیکن بس یہ خیال رہے کہ ہر اچھا ارادہ آزمائشوں سے گزر کر ہی پورا ہوتا ہے۔ آج ہم نے جو عہد کیا ہے اُسے پورا کرنے میں بھی مختلف رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی آزمائش، کسی رکاوٹ میں ڈالے بغیر ہمیں اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمالے۔ آمین۔

امیری غریبی اور پیری مریدی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

جس معاشرے میں غریب کو عزت نہیں ملتی اور اس کے ساتھ برابری کا رویہ نہیں رکھا جاتا، وہ معاشرہ اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ اس میں حق بھی بے اثر ہے اور خیر بھی بے تاثیر۔ جہاں دولت اور طاقت عزت کا سب سے بڑا سبب بن جائیں، اس سوسائٹی میں ایسی گراوٹ سرایت کر جاتی ہے کہ لوگ انسان ہونا بھی بھول جاتے ہیں اور ان پر دین مؤثر رہتا ہے نہ کوئی نظریہ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے یہاں غریبوں میں عزتِ نفس کا جذبہ اور احساس بہت کمزور ہے۔ انہوں نے گویا قبول کر لیا ہے کہ وہ معاشرے کا نچلا طبقہ ہیں جو خود اپنی نظر میں ہی معزز نہیں بن سکتا۔ اس نفسیاتی سطح پر دین ہو یا دنیا، دونوں ہی روٹی کپڑے کی فکر میں سما جاتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی مقاصد تو بہت دور کی چیزیں ہیں، غریبوں کی دنیاوی خواہشات اور تمنائیں بھی پیٹ سے پیدا ہوتی ہیں، اور یہ کوئی اقلیتی طبقہ نہیں ہے بلکہ ایک بڑی اکثریت ہے۔ ہماری سماجی سطح کا تعین اور ہماری اخلاقی درجہ بندی انہی کو دیکھ کر ہوگی۔ کیونکہ کسی معاشرے کو دیکھتے وقت پہلے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس کی بلندیاں کیا ہیں بلکہ اس پر فوکس کیا جاتا کہ اس کی پستیاں کیا ہیں۔ بلندی کم عمر ہوتی ہے اور پستی لمبی عمر پاتی ہے۔ سوسائٹی طبقات کے درمیان تعلق سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ تعلق ہم آہنگی کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور تصادم کی صورت میں بھی اظہار کرتا ہے۔ طبقات

میں مقصدی ہم آہنگی اور مفاداتی کشاکش کے نتیجے ہی میں معاشرہ وجود میں آتا ہے۔
اس پہلو سے اپنا جائزہ لیں تو صورتِ حال زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ ہمارے اندر غریب اور امیر کسی بھی طرح کی ہم آہنگی اور موافقت نہیں رکھتے، وہ چاہے دینی ہو یا اخلاقی، تہذیبی ہو یا نفسیاتی، ان دونوں طبقوں میں کسی طرح کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ معاشرے کی تعمیر کرنے والی طبقاتی ہم آہنگی تو بہت بڑی بات ہے، ہم نے تو شاید شاذ و نادر ہی دیکھا ہو کہ کوئی امیر کسی مسکین کو سلام کر رہا ہے۔ سلام کرنا صرف غریب کی ذمہ داری ہے اور امیر کے لیے سلام کا جواب دینا بھی ضروری نہیں۔ ننانوے فی صد مواقع پر غریب سر جھکا کر سلام کرتا ہے اور امیر رعونت سے سر ہلا کر یا اس بے چارے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر گویا اس کے سلام سن لینے کا خاموش اظہار کافی سمجھتا ہے۔ گویا یہ بھی میرا احسان ہے اور تمہارے لیے بڑی بشارت ہے کہ میں نے تمہارے سلام کو سننے کے قابل سمجھا۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ غریب اس فرعونی انداز کو بھی اپنے اوپر احسان سمجھتا ہے۔ آپ خود سوچیے جہاں دینی معاشرت کو ایک اقداری تسلسل کے ساتھ محفوظ رکھنے والا سب سے بڑا عمل یعنی سلام اس حالت کو پہنچ جائے وہاں دین داری کی سطح کیا ہوگی اور آدمیت کس درجے پر ہوگی! امیر اور غریب کا یہ اندازِ تعلق صرف بازاروں میں نہیں ہے، مسجدوں میں بلکہ حرمین میں بھی عام ہے۔ اتنا ہی عام جتنا بازاروں اور دفتروں میں ہے۔ ہم نے تو دین کو بھی غریب کو دبائے رکھنے کی قوت بنا ڈالا ہے۔ کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کسی دینی جماعت یا تحریک نے امیر غریب کی ایک ظالمانہ تفریق کو ختم کرنے کی ٹھوس اور مربوط کوشش کی ہو؟ ہم نے دین کو ایسا بنا لیا ہے کہ عورتوں اور غریبوں کے لیے یہ دینِ رحمت، دینِ زحمت بن گیا ہے۔ عورتوں نے تو خیر بہت بڑے پیمانے پر اس مردانہ بالادستی کو چیلنج کر دیا جو دین کے نام پر مسلط کی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے دین کی غلط مراد کو جھٹلاتے ہوئے دین کی صحیح مراد کا بھی انکار کر دیا۔ یعنی ایسا ماحول بنا دیا گیا ہے اور سماجی جبر کو دین

کا ایسا لبادہ اوڑھا دیا گیا ہے کہ اس جبر کا شکار ہونے والے طبقات خود دین ہی سے تصادم کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اللہ کا عذاب نہیں ہے کہ الحاد کا سب سے بڑا سبب دین کا نام لینے والے بن گئے ہیں! اہلِ دین کی موجودہ اکثریت نے نعوذ باللہ دین اور انسانیت کو متضاد بنا کر رکھ دیا ہے اور دین اور اخلاق میں بیگانگی کا ماحول پیدا کر ڈالا ہے۔ تو بہر حال اس آدمی کا کیا دین جو امیر غریب کو برابر نہیں جانتا اور مسکینوں سے محبت نہیں کرتا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ملاپ سے بننے والی شخصیات سے مکمل طور پر چھٹکارا پائے بغیر اور اسے دینی کور دینے کی شیطانی عادت سے نجات حاصل کیے بغیر تحریک و دعوت وغیرہ کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

تبلیغی جماعت غالباً سب سے بڑی دینی جماعت ہے اور اس کا دائرۂ اثر الحمد للہ عالم گیر ہے۔ لیکن افسوس اس نے بھی مسلم معاشرت میں سرایت کر جانے والے اس روگ کو توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ حالانکہ یہ جماعت اپنے دستیاب وسائل کے ساتھ اگر حسنِ معاشرت کو اپنا ہدف بنا لیتی تو آج مسلمانوں کا سماجی اسٹرکچر کم از کم غیر انسانی نہ رہتا۔ اور ایک تبلیغی جماعت ہی نہیں بلکہ کسی دینی جماعت نے بھی دین کے نفسیاتی اور معاشرتی اقدار کی تجدید کو اپنا مقصود کم از کم عملاً نہیں بنایا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو مسلم معاشروں میں سے غربت و افلاس کا خاتمہ ہو چکا ہوتا اور عورتوں میں دین بیزاری کے اسباب ہی نہ پیدا ہوتے۔ ابھی ہمیں اندازہ نہیں ہے کہ فیمینزم ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ دستک ایسی ہے جس پر دروازہ زیادہ دیر تک بند نہیں رہ سکتا۔ فیمینزم کو ہمارے اندر جگہ بنانے کا موقع مل گیا تو مسلم دنیا میں اسلام کو سب سے بڑا چیلنج مردوں کی جانب سے نہیں بلکہ عورتوں کی طرف سے پیش آئے گا۔ فیمینزم پہلے ہی مرحلے میں ترکِ دین کو انتہائی خوش گوار اور نہایت ضروری بنا دیتا ہے۔ اسی طرح جیسے مارکسزم نے غریبوں میں خدا اور مذہب کے انکار کو محبوب بنایا۔ لیکن فیمینزم مارکسزم کی طرح کوئی نظریاتی نظام نہیں

ہے بلکہ ایک رویہ اور مزاج ہے۔ اس لیے اس کا تسلط اگر قائم ہو گیا تو اس کے ٹوٹنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ مارکسزم میں ایک جبر کا عنصر تھا جو اس کے زوال کا سبب بنا، کیپٹلزم میں تو آزادی ہی آزادی ہے۔

تو بات یہ ہو رہی تھی کہ ہمارے معاشرے میں غریب کی کوئی عزت اور کوئی تکریم نہیں ہے۔ غریب تحقیر کی زندگی جیتا ہے اور تذلیل کی موت مر جاتا ہے۔ غریب اور اچھوت میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ والدین بھی خوشحال بیٹے کو غریب بیٹے پر ترجیح دیتے ہیں۔ آدمی کسی حادثے کے نتیجے میں غریب ہو جائے تو ماں باپ، بھائی بہن اور دوست احباب اس سے دوری پیدا کر لیتے ہیں۔ غریب ہوتے ہی آدمی کو سب سے پہلے عزتِ نفس کے شعور اور احساس کو چھوڑنا پڑتا ہے اور اس اٹل قانون کو ماننا پڑتا ہے کہ غریب کسی عزت کا مستحق نہیں ہے، یعنی غریب کو انسان ہونے کی ضد نہیں کرنی چاہیے۔ عزتِ نفس سے دست بردار ہو جانے والے اس طبقے میں کوئی طبقاتی انقلابی جدو جہد نہیں پیدا ہوتی بلکہ ایک حیوانی انداز میں بدلہ لینے کی خواہش جنم لیتی ہے جس سے جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کو سمجھ لیں کہ غریب کو عزت کی ضرورت نہیں ہے، اسے تو بس روٹی، کپڑا اور مکان چاہیے۔ اسے جنت کی طلب نہیں ہے، اسے تو کچھ دنیاوی سہولتیں درکار ہیں۔ اسے دوزخ سے ڈر نہیں لگتا کہ اس کی دنیا ہی جہنم بن چکی ہے۔ اسے اس جہنم سے نکالے بغیر اور عزتِ نفس کے احساس کی طرف واپس لائے بغیر اگر وعظ و نصیحت سننے پر مجبور کر بھی دیا گیا تو اس کا حاصل حصول کچھ نہ ہوگا۔ غریب کا خدا بھی ایک طاقتور اور امیر آدمی کی طرح ہوتا ہے جس سے وہ روٹی کپڑے کی امید باندھ لیتا ہے اور بس۔ مڈل کلاس اور اپر کلاس کی سفاکی اور چالاکی نے غربت اور افلاس کو پیدا کیا اور پھر اسے ہر طرح کی پستی کا مرادف بنا دیا۔ غریب چھوٹا ہے، اس کا ذہن چھوٹا ہے، اس کا اخلاق چھوٹا ہے، اس کی دنیا چھوٹی ہے، اس کا دین چھوٹا ہے یہاں تک کہ اس کا خدا بھی اسی کی

طرح چھوٹا ہے۔ اس ماحول میں آخری ظلم یہ کیا گیا کہ دنیا کو چھین کر اتے گویا دین کا مالک بنا دیا گیا۔ دین پر عمل کرنے سے لے کر عالم بننے تک کی ذمے داریاں غریب پر ڈال دی گئیں، اس غریب پر جس کے ذہن وقلب پر شاہ دولہ کا آہنی طوق پہلے ہی کس دیا گیا تھا۔ لادینی منصوبے کی تکمیل کے لیے اٹھایا جانے والا یہ قدم کتنا مہلک ثابت ہوا اس کا مشاہدہ ہم آج کر رہے ہیں۔ غریب اور امیر کی فطری طبقاتی کشاکش کو دینی رنگ دے کر بہت چابک دستی کے ساتھ ایک ایسے فساد میں بدل دیا گیا ہے جو لادینیت کے پھیلاؤ کے لیے ایک مؤثر دلیل کا کام دے رہا ہے۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی صاحب نے پوچھا کہ عالموں اور مولویوں میں فلاں فلاں خرابیاں کیوں ہیں۔ وہ صاحب اس زمانے کے حساب سے کسی اچھی سرکاری ملازمت میں تھے اور خوش حال تھے۔ جواب دینے سے پہلے مولانا نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارے کتنے بیٹے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ چار۔ یہ تعداد صحیح یاد نہیں، لیکن جو بات کہنے جا رہا ہوں اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حضرت تھانوی نے پوچھا ان میں سے کتنے دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟ ان صاحب نے کہا کہ کوئی نہیں، سب اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ مولانا نے یہ سن کر درشتی سے فرمایا کہ اہلِ مدرسہ اور مولویوں کے اندر آنے والی خرابیوں کی ذمہ داری تم ایسے لوگوں پر جاتی ہے۔ مجھے دیکھو، میرے والد خاصے خوشحال آدمی تھے اور اپنے بیٹوں میں انہیں مجھ سے زیادہ محبت تھی۔ میں ذہانت اور صورت شکل میں بھی اپنے بھائی سے آگے تھا۔ میرے والد نے مجھے دینی تعلیم دلانے کا عزم کیا اور اس پر ثابت قدم رہے۔ کاش تم لوگ بھی میرے والد کے راستے پر چلتے تو مجھ سے یہ شکایت کرنے کی نوبت نہ آتی۔ یہ واقعہ میں نے نوجوانی میں کہیں پڑھا تھا اس لیے ممکن ہے کہ نقل کرنے میں کچھ اونچ نیچ ہو گئی ہو مگر اتنا یقینی ہے کہ اس واقعے کا خلاصہ اور مفہوم یہی تھا جو میں نے عرض کیا۔ کیا آج بھی صورتِ حال وہی نہیں ہے؟ بلکہ کیا آج کی صورتِ حال اس وقت

سے بدتر نہیں ہوگئی؟ موجودہ مذہبی ملٹینسی دراصل ایک پاور گیم ہے جسے کھیلنے والے خود غریب نہیں ہیں مگر غریبوں کو ایک طاقتور خدا کا سپاہی بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے، فی الوقت تو ہم اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ غریب سے محبت نہ ہو تو دین داری محض ایک مفروضہ ہے اور غریبوں کی تحقیر پر مبنی نظامِ معاشرت دینِ آدمیت کی توہین اور انکار ہے۔ اب ذرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ ارشادات سنیے:

سَمِعْتُ حَارِثَةَ بْنَ وَهْبٍ الْخُزَاعِيَّ، قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعِّفٍ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ، أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ: كُلُّ عُتُلٍّ، جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ))

جناب حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: کیا میں تم کو یہ بات نہ بتاؤں کہ جنتی کون لوگ ہیں، سنو! ہر وہ کمزور شخص جو کمزور اور حقیر سمجھا جاتا ہے، ایسا شخص اگر اللہ تعالیٰ کے اعتماد اور بھروسے پر قسم کھالے تو اسے اللہ تبارک وتعالیٰ پورا فرما دیتا ہے۔ پھر فرمایا: کیا یہ بتاؤں کہ دوزخی کون ہے، سنو! ہر بدخو، متکبر اور بخیل دوزخی ہے۔ (متفق علیہ)

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ، أَنَّهُ قَالَ: مَرَّ رَجُلٌ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهُ جَالِسٍ: ((مَا رَأْيُكَ فِي هَذَا)) فَقَالَ: رَجُلٌ مِنْ أَشْرَافِ النَّاسِ، هَذَا وَاللهِ حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ أَنْ يُنْكَحَ، وَإِنْ شَفَعَ أَنْ يُشَفَّعَ، قَالَ:

فَسَكَتَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ آخَرُ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَا رَأْيُكَ فِي هَذَا))فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، هَذَا رَجُلٌ مِنْ فُقَرَاءِ الْمُسْلِمِينَ، هَذَا حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ أَنْ لاَ يُنْكَحَ، وَإِنْ شَفَعَ أَنْ لاَ يُشَفَّعَ، وَإِنْ قَالَ أَنْ لاَ يُسْمَعَ لِقَوْلِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:((هَذَا خَيْرٌ مِنْ مِلْءِ الأَرْضِ مِثْلَ هَذَا))

جناب ابی عباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب سے ایک شخص گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے دریافت فرمایا کہ اس شخص سے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ صاحب بولے کہ یہ شخص لوگوں میں ممتاز ہے، واللہ اگر یہ کسی کو نکاح کا پیغام دے تو قبول کیا جائے گا، اگر کسی کی سفارش کرے تو وہ مانی جائے گی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت فرمایا، پھر ایک اور شخص وہاں سے گزرا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی صاحب سے پوچھا کہ اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص مسلمان فقرا میں سے ہے، یہ اگر کسی کو نکاح کا پیغام دے تو قبول نہ کیا جائے، اگر کسی کی سفارش کرے تو مانی نہ جائے، اگر کسی کو کوئی بات کہے تو سنی نہ جائے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا: یہ فقیر، پہلے جیسے آدمی سے بھری ہوئی دنیا سے بہتر ہے۔ (متفق علیہ)

جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک کالی کلوٹی عورت، مسجد کی خدمت کیا کرتی تھی، راوی کو شک ہے کہ وہ عورت تھی یا کوئی جوان شخص۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے نہ دیکھا تو اس کے متعلق دریافت فرمایا، صحابہ نے بتایا کہ اس کا تو انتقال ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا: مجھے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی! پھر فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتاؤ، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کی قبر کی نشان دہی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر نماز پڑھی، پھر فرمایا: یہ قبریں اپنے مکینوں کے لیے اندھیروں سے لبریز ہوتی ہیں، میرے ان پر نماز پڑھ لینے سے اللہ تعالیٰ ان قبروں کو منور اور روشن فرما دیتا ہے۔ (متفق علیہ)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: ((رُبَّ أَشْعَثَ، مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ))

رواه مسلم

جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے بھی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بہت سے بکھرے بالوں والے، غبار آلود لوگ، جنہیں دروازوں سے دھکے دیے جاتے ہیں، ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر کے رہتا ہے۔ (مسلم)

ہمارے اندر دین کا مطلوبہ نظامِ تعلق، نفسیاتِ تعلق اور معاشرت قائم نہ ہونے کا ایک سبب اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم بعض تعلقات اور رشتوں میں ادب کے نام پر مبالغہ کرتے ہیں۔ لیکن نہیں، رشتے تو ہمارے اندر کمزور پڑتے جارہے ہیں، ان میں ادب کا پہلو بھی دبتا جارہا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ چند تعلقات ہیں جن میں ہم بہت مبالغہ کرتے ہیں۔ ایسا مبالغہ جو شخصیت پرستی بن جاتا ہے، جیسے پیر اور مرید کا تعلق ہے، جیسے امام اور مقلد کا تعلق ہے۔ یہ مبالغہ نفسیاتی طور پر بھی اچھا نہیں ہے، اخلاقی طور پر بھی اور دینی طور پر بھی معیوب ہے۔ آپ نے بھی بارہا دیکھا ہوگا کہ پیر صاحب نماز کے انتظار میں اگلی صف میں بیٹھے ہیں اور ان کے مریدین وہاں جگہ ہونے کے باوجود پچھلی صف میں بیٹھے

حقیقت یہ ہے کہ پیری مریدی کے کلچر نے انسان کے شرف اور آزادی کو سلب کر رکھا ہے۔ یہ کلچر خانقاہوں اور درگاہوں تک محدود نہیں رہا بلکہ سیاسی جماعتوں میں بھی داخل ہو گیا۔ اکثر سیاسی جماعتیں، خواہ مذہبی ہوں یا سیکولر، یہی کلچر اور یہی مزاج رکھتی ہیں۔ پارٹی لیڈر وہی حیثیت اختیار کر گیا ہے جو کسی بہت بڑے گدی نشین کی اپنے مریدوں اور معتقدوں میں ہوتی ہے۔ شخصیت پرستی کی اس وبا کے دینی اسباب تو خیر سے واضح ہیں، ان کے کچھ تہذیبی، تاریخی اور نفسیاتی اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک سبب یہ ہے کہ ہم دورِ غلامی سے پیدا ہونے والی تہذیب اور نفسیات سے چھٹکارا نہ پا سکے اور ان تاریخی تبدیلیوں سے لاتعلق رہ گئے جن کی بدولت انسان ہونے کے معیار میں ایسا اضافہ ہوا جو خود دین کو مطلوب ہے۔ تاریخ نے دین کی مراد کے عین مطابق غلامی کے تمام اداروں کو بھی ختم کیا اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیات کو بھی کم از کم اس حد تک کمزور ضرور کیا کہ آج کے انسان کے اجتماعی وجود میں مساوات کا تصور اور داعیہ زیادہ نہیں تو اتنا مضبوط بہر حال ہو چکا ہے کہ اس کے ابتدائی مظاہر بھی وحدتِ انسانی اور اخوتِ ایمانی کے دینی مقاصد تک پہنچنے میں بہت مددگار ہو سکتے ہیں، اور یہ امید باندھی جا سکتی ہے کہ جدیدیت کی نظریاتی تاثیر سے محفوظ رہتے ہوئے ہم اس تاریخی اور تہذیبی پیش رفت کو دین داری کے جذبے اور اعتماد کے ساتھ دینی آئیڈیلز کی طرف متحرک رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس دنیا کو فطرت اور ہدایت کا سنگم بنا سکتے ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اقبال کی اصطلاح میں خوئے غلامی سے نجات حاصل کی جائے اور اس کے تمام ذہنی، قلبی اور عملی مظاہر کو مسمار کیا جائے۔ آقا و غلام اور حاکم و رعایا کے تناظر اور نفسیات سے نکلے بغیر ہماری دنیا بھی اسی طرح ڈراؤنی رہے گی اور ہمارا دین بھی اسی طرح اجنبی اور بے تاثیر رہے گا۔ اصل میں یہ ایک پاور گیم ہے اور اس سے پیدا ہونے والی ہمہ گیر نفسیات ہے جو دنیا سے تجاوز کر کے دین میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ ایک عام

آدمی جب کسی بزرگ سے تعویذ لینے جاتا ہے یا کسی مفتی سے فتویٰ لینے جاتا ہے تو اکثر جگہوں پر اسے اسی پروٹوکول سے گزرنا پڑتا ہے جو صاحبانِ اقتدار اور اہلِ اختیار اور اہلِ ثروت سے ملتے وقت ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سب اسی حاکم ورعایا والی نفسیات کے مختلف مظاہر ہیں۔ حبِ جاہ اور حبِ مال سے بچنا ایمان کا تقاضا ہے، کوئی فقہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی طرف ہمہ وقت متوجہ رہنے والا مزاج دین دار کہلانے والے بالاتر طبقات میں، یعنی علما اور مشائخ میں، اسی طرح کارفرما دکھائی دیتا ہے جیسے طاقتور دنیا داروں میں۔ یقیناً کچھ لوگ اس روحانی جذام سے بچے ہوئے ہیں مگر ان بے چاروں کی کوئی نہیں سنتا، انھیں اپنے لیے نمونہ نہیں بنایا جاتا اور ان کے مرید اور مقلد اگر ہیں بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایسے حضرات کی دین داری چونکہ حقیقی ہے اس لیے وہ مذہبی حلقوں میں بھی اجنبی اور اکیلے ہو گئے ہیں۔ دنیا طلبی اور خودنمائی کا یہی جنون مریدوں اور اپنے پیروکاروں کو پیر اور لیڈر کا غلام بنا سکھاتا ہے۔ تعلیم وتربیت اور علم وسیاست کے میدانوں پر قابض یہ طاقتور طبقہ ان کارخانہ داروں کی طرح ہے جن کے لیے مرید اور مقلد محض ایک مزدور ہے جس کی محنت اور اطاعت سے سیٹھ صاحب کا کارخانہ چلتا رہے۔ اب آپ خود سوچیے کہ اس غیر اسلامی، غیر انسانی ماحول میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک آرائشی حوالے سے زیادہ کیا رہ جائے گی اور تعلق باللہ اور تعلق بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودی اقدار اور اخلاقی آئیڈیلز کس طرح ہمارے اندر جگہ بنا پائیں گے!

تو بہرحال، دین کو اس کے حقیقی تقاضوں کے ساتھ اپنے اندر جذب کرنے کا عزم کریں ورنہ اسی طرح چرب زبان واعظوں، خدا فروش پیروں اور دنیا طلب رہنماؤں کی حکومت رہے گی اور ہم اسی طرح اپنی استعدادِ بندگی کو فلاں اور فلاں پر صرف کرتے رہیں گے۔

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح
در عمارت گریِ گنبدِ دستارِ خود اند

تو بھائی، کم از کم یہ طے کرلو کہ اس شخص سے مرید ہونا ہے نہ اس کی پیروی کرنی ہے جسے پیری اور قیادت ترکے میں ملی ہو۔ اس فیصلے پر ڈٹ جاؤ، ان شاء اللہ دھوکا نہیں کھاؤ گے۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ بیٹا باپ کی جانشینی کی اہلیت رکھتا ہو لیکن پھر بھی مصلحت یہی ہے کہ نسلی اور نسبی جانشینی کی رسم کا سرے سے انکار کیا جائے۔ ننانوے فی صد سے زیادہ صورتوں میں یہ محض دنیا طلبی کی منظم روایت ہے۔ بیٹا اگر دنیا دینے کی روایت میں باپ کا جانشین بنتا ہے تو اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے۔ اس میں جانشینی اس کا فرض بھی ہے اور استحقاق بھی، لیکن دنیا لینے کی روایت میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: پیری مریدی میں سارا خطرہ مرید کو ہی ہے یا پیر کو بھی ہوشیار رہنا چاہیے؟

جواب: سچی بات یہ ہے کہ پیر کو زیادہ خطرہ ہے۔ ہم پیری مریدی کی مسخ شدہ روایت پر گفتگو کر رہے تھے اس لیے نصیحت کا رخ مرید کی طرف رکھا کیونکہ پیر تو اب نصیحت سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں کہ ظلم کی صورتِ حال میں ظلم سے بچنے کی تدبیریں مظلوم کو بتائی جاتی ہیں، ظالم کو نہیں۔ اسی طرح پیری مریدی کے موجودہ کلچر کے حصے سے نکلنے کی دعوت مریدوں کی دی جائے گی جو اس ظلم کا شکار ہیں۔ لیکن اگر پیری مریدی کی روایت اپنی صحیح صورت میں ہو، یعنی ہر لحاظ سے مطابقِ سنت ہو، تو اس وقت خطرہ پیر کو ہے، مرید کو بالکل نہیں۔ تعلق باللہ کے لیے درکار تزکیے کو مقصود بنا کر مسندِ ارشاد پر بیٹھنے والا شیخ جتنا مریدوں کی اصلاح کے لیے فکر مند رہتا ہے، اس سے کہیں زیادہ اس خوف میں رہتا ہے کہ اس کا نفس اسے کوئی دھوکا نہ دے دے کہ اخلاص، تقویٰ

اور توکل میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور وہ مریدوں کی فطری عقیدت و محبت کو اپنی حبِ جاہ اور حبِ مال کی تسکین کے لیے استعمال کرنے لگے۔ شیخِ صادق اللہ کی طرف یکسو رہتے ہوئے اپنے مریدوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ہر وقت اس یکسوئی کو برقرار رکھنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اسی لیے ہمارے سلف سب سے زیادہ جن چیزوں سے بچتے تھے ان میں سے ایک خودنمائی ہے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ بڑا بننے سے بچیں اور اگر بڑائی کو پوزیشن لینی بھی پڑے تو وہ مرید اور شاگرد کے مفاد میں ہو، اپنی کسی خواہش کے نتیجے میں نہ ہو۔ یعنی بڑائی انتظامی ہو، دینی نہ ہو۔ لیکن افسوس یہ سب ماضی کے قصے بن کر رہ گئے، آج کے پیروں کا حال الا ماشاءاللہ بالکل مختلف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مفہوم میں فرمایا کہ وہ شخص اپنا ٹھکانا جہنم میں کر لے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کی آمد پر لوگ کھڑے ہو جایا کریں۔ موجودہ خانقاہی کلچر سر سے پاؤں تک اس ارشادِ مبارک کی خلاف ورزی پر کھڑا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مفہوم میں بھی ارشاد فرمایا کہ میرے آگے تصویر بن کر نہ کھڑے رہا کرو جس طرح عجمی لوگ بادشاہوں کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ شاید ہی پیری مریدی کے موجودہ کلچر میں یہ ارشاداتِ نبوی کسی پیر کی زبان سے نقل ہوتے ہوں۔ تو بالکل نہیں، پیر و مرید کا رشتہ بھی اخوت اور مساوات سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کا بندہ ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتی ہونے کی حیثیت سے ہم سب برابری کی اصل پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے سے کم تر اور برتر ہیں۔ پیر کی برتری کا انکار نہیں لیکن اس میں بھی برابری کا اصول ایک اساسی حیثیت سے جاری رہنا چاہیے اور یہ ذمہ داری پیر کی ہے کہ وہ تعلق کی اس بنیادی ترین قدر کو فعال رکھے۔
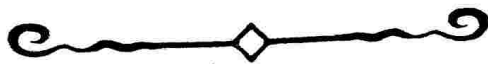
بندگی اور اس کا بنیادی تقاضا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

تہذیب پر زوال آتا ہے تو سب سے پہلے اس کا تصورِ انسان بدل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تہذیب اپنے تصورِ انسان سے گھبرانے لگتی ہے۔ جس تصورِ انسان کی ہم بات کر رہے ہیں وہ کوئی فلسفیانہ اور پیچیدہ تصور نہیں ہے۔ ایک سادہ سا تصور ہے جو یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے اصلی اور مستقل مقاصد کیا ہیں اور ان مقاصد تک پہنچنے کے راستے کیا ہیں۔ اس پس منظر میں مسلم تہذیب کا تصورِ انسان یہ ہے کہ ہمارا سب سے بڑا مقصدِ زندگی اللہ کو راضی کرنا ہے۔ ہمیں اسی لیے تخلیق کیا گیا ہے کہ دنیا کے دارالامتحان میں اس طرح زندگی گزاریں کہ جنت میں داخل ہو جائیں اور اللہ کی خوشنودی حاصل کر لیں۔ گویا ہمیں زندگی کو اللہ کی طرف یکسو ہو کر گزارنا ہے، زندگی کے ہر عمل میں آخرت کو اصل گھر سمجھتے ہوئے اللہ کی معرفت، محبت، خشیت اور اطاعت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور پیروی کرتے ہوئے اپنی منزل یعنی اللہ کی خوشنودی کی طرف متحرک رہنا ہے۔ یہ مستقل یکسوئی ہے، کچھ خاص اعمال سے پیدا ہونے والی عارضی یکسوئی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نماز میں تو اللہ کی طرف متوجہ رہنا ہے اور سلام پھرتے ہی یہ یکسوئی معاف

ہے۔ اللہ کی طرف یکسو رہنا سانس لینے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ہمیں یہاں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اللہ کی طرف اپنے دین کو خالص اور بندگی کو صادق رکھتے ہوئے یکسو رہ کر دکھائیں۔ ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ دنیا کو آخرت کے تناظر میں دیکھیں اور خود اپنے آپ کو اللہ کی طرف یکسوئی کے پیمانے سے ناپیں۔ ہم اتنے ہی سچے ہیں جتنے خدا کی طرف یکسو ہیں اور اتنے ہی جھوٹے ہیں جتنا اس یکسوئی میں خلل ہے۔ سمجھ گئے ناں! تو اب یہ یکسوئی عبادات میں بھی ہے، اخلاق میں بھی ہے، معاملات میں بھی ہے۔ غرض زندگی کے جتنے اسالیب ہیں، ان سب میں اللہ کی طرف یکسو رہنا ہے اس کے حکم کے مطابق، اس کی منشا کے مطابق، اس کی مرضی کے مطابق اور اس کی طرف سے بھیجے گئے نمونۂ کامل یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق۔ اللہ اس راستے سے نہیں ملتا جس کے واحد رہبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ ہوں۔ یہ یاد رکھنا کہ اس یکسوئی کا سارا ساز و سامان جس جگہ پر جمع اور محفوظ ہے، اس جگہ کو سنت کہتے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ اللہ کی طرف یکسوئی کے جو فطری ذرائع اور نیچرل صورتیں ہیں وہ بھی یکسوئی سے خالی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مثلاً نماز، مثلاً دعا، مثلاً تلاوت، مثلاً ذکر۔ یہ وہ معمولات ہیں جن میں داخل ہوتے ہی ہم اللہ کی طرف خود بخود متوجہ ہو جاتے ہیں، دل اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے، ذہن اس کی جانب یکسو ہو جاتا ہے اور طبیعت اس کی طرف لپکنے لگتی ہے۔ اس طرح کی فطری اور خود بخود یکسوئی پیدا کر دینے والے اعمال بھی ہم پر بے اثر ہوتے جا رہے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو یہ کہہ سکیں کہ مصلے پر کھڑے ہوتے ہی، نماز کے لیے تکبیرِ تحریمہ کہتے ہی میں گویا اللہ کے حضور میں پہنچ جاتا ہوں۔ یا دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہی گویا میرے اور میرے معبود کے درمیان سے حجابات اٹھنے لگتے ہیں۔

اللہ نے میرے لیے بندگی کا جو اسٹرکچر بنایا ہے، اس میں ایک کھڑکی بھی رکھی ہے کہ اسے ہمیشہ کھلا رکھنا۔ اس روزن سے جب بھی جھانکو گے، میں نظر آ جاؤں گا۔ یہ کھڑکی

صرف نماز میں، تلاوت میں، ذکر و دعا میں نہیں کھلتی بلکہ ہمہ وقت کھلی رہتی ہے۔ ہماری ذمہ داری بس اتنی ہے کہ ہر حال میں، تمام حالات میں اور ہر عمل میں اس کھڑکی سے اپنی آنکھیں نہ ہٹنے دیں اور اللہ کو گویا دیکھنے میں مشغول رہیں۔ تو ایسے سامانِ دید کو اور ایسے اسبابِ یکسوئی کو ہم لوگوں نے غفلت اور ناقدری سے ضائع کر دیا اور پھر اس کا بدل ڈھونڈتے پھرتے ہیں ھو ھو کی ضربیں لگا کر، فلاں تحریک میں شامل ہو کر، انقلاب کے نعرے بلند کر کے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی صورتِ حال بن گئی ہے کہ دینی اعمال بھی اللہ کو چھپانے والے اعمال بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم عبادت میں اللہ کی طرف یکسو نہیں ہو پاتے تو باقی معاملات میں کہاں سے ہوں گے۔ جو اعمال قدرتی طور پر اللہ سے جوڑ دیتے ہیں، ہم ان میں اللہ کا قرب محسوس نہیں کرتے تو عام سے دنیاوی اعمال میں کیسے اللہ کی طرف یکسو رہ سکتے ہیں۔ اللہ سے تعلق حقیقتِ وجود ہے اور عبادت اسے حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ۔ عبادت دراصل اللہ سے تعلق کے آداب اور احساسات سکھا دیتی ہے۔

اس کے بعد اخلاق کا نمبر آتا ہے۔ جس طرح عبادت وجود کی حقیقت ہے، اخلاق اس حقیقی وجود کے احوال کا نام ہیں۔ یعنی اخلاق حقیقی وجود کو اندر باہر متحرک رکھنے والی قوت ہے اور اس کی حرکیات (Dynamics) کی بنیاد۔ ان معنوں میں انسان اپنی حقیقت میں اللہ کا بندہ ہے اور اپنی حالت اور فعلیت میں ایک اخلاقی وجود ہے۔ اللہ نے مجھے اخلاقی وجود اس لیے دیا ہے کہ میں خالق کے ساتھ تعلق میں مخلص اور صادق رہتے ہوئے مخلوق کے ساتھ تعلق میں بھی سچا اور کامل رہوں۔ یعنی اخلاق نام ہے خالق کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے مخلوق کے ساتھ تعلق کے تقاضوں کو اچھی طرح سے ادا کرنے کا۔ اور یہ تقاضے بھی فطرت بتاتی ہے کیونکہ اخلاق اپنی بنیادی ساخت میں فطری ہوتے ہیں، قانونی نہیں۔ شریعت اخلاق پر حاکم ہوتی ہے، اس کی خالق نہیں۔ اب دیکھ لیجیے کہ ہماری عبادت تعلق باللہ کا شعور اور احساسات نہیں پیدا کرتی اور ہمارے اخلاق میں دوسروں

کے ساتھ ایثار، خیر خواہی، تواضع کے عناصر نہیں پائے جاتے۔ عبادت کو غفلت نے بے روح کر دیا ہے اور اخلاق کو خود غرضی کھا گئی ہے۔ میں تو بس اس بات پر نظر رکھتا ہوں کہ مجھے آپ سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اس ذمہ داری سے بھاگتا ہوں کہ مجھے آپ کو کیا فائدہ پہنچانا چاہیے۔ خود غرضی اخلاق کی مکمل ضد ہے، خود غرض لوگوں کی سوسائٹی اخلاقی ویرانہ ہوتی ہے۔ بدتمیزی اور گالم گلوچ وغیرہ یقیناً بد اخلاقی ہیں لیکن خود غرضی تو اخلاق کا فقدان ہے اور بد اخلاقی کی ہر قسم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایک بدزبان آدمی بد اخلاق ہوتا ہے اور ایک خود غرض شخص بے اخلاق۔ پہلا جزوی طور پر اخلاق سے عاری ہے جبکہ دوسرا کلی طور پر اخلاق سے محروم ہے۔ خود غرض لوگوں کا تمام mannerism کسی لاش کی تزئین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی غور سے دیکھنے کی کوشش کیجیے کہ ہمارے یہاں بھی اخلاق کے ظاہری مراسم مردہ جسم کی مشاطگی سے زیادہ کیا رہ گئے ہیں!

عبادت اور اخلاق کے بعد تیسرا درجہ ہے معاملات کا۔ یعنی، دنیا سے فائدہ حاصل کرنا یا پہنچانا۔ معاملات بھی بندگی اور انسانیت کی بنیاد پر چلتے ہیں تاہم ان کی مہار حلال وحرام کے تصور کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ انسان اللہ کا بندہ ہے اور ایک اخلاقی وجود ہے، اس کا سارا نظام العمل اللہ کے حکم پر مبنی ہے اور حلال وحرام کے قطعی معیار پر قائم ہے۔ جس طرح عبادت یہ بتاتی ہے کہ آپ کا تصورِ خدا کیا ہے اور اخلاق یہ دکھاتا ہے کہ آپ کا تصورِ انسان کیا ہے، اسی طرح معاملات سے یہ پتا چلتا ہے کہ ایک خاص طرح کا تصورِ خدا اور تصورِ انسان رکھنے والے کی حیثیت سے آپ کا تصورِ دنیا کیا ہے۔ معاملات کو اگر صرف فائدہ حاصل کرنے تک محدود کر لیا جائے تو بھی یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ ہاں، اس عمل کو اللہ کے بنائے ہوئے حدود کے تابع رکھنا میری ذمہ داری ہے۔ مجھے فائدہ اٹھانے سے نہیں روکا گیا، اللہ نے اس دنیا میں افادیت کا عنصر بھی رکھا ہے لیکن بس حلال وحرام کی پابندی بہرحال کرنی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ زندگی کا سب سے بڑا

مقصد اللہ کی طرف یکسو رہنا ہے، حلال وحرام کی تمیز اس مقصد کو حاضر رکھتی ہے اور یکسوئی کے ملکہ بڑھاتی ہے۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ معاملات اس یکسوئی کے ہونے نہ ہونے کی سب سے بڑی کسوٹی ہیں۔ لیکن کیا میں اور کیا میرا خیال، یہ بات تو دین، دنیا اور انسان کے انتہائی اندر تک جھانک لینے کی محیر العقول بصیرت اور فراست رکھنے والی ایک بے مثل ہستی یعنی سیدنا عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی فرمائی ہے کہ آدمی کا نماز روزہ نہ دیکھو، اس کے معاملات دیکھو! اس قولِ مبارک کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ معاملات میں اخلاقیات بھی داخل ہیں اور عبادات کا عملی خلاصہ، یعنی، اللہ کے احکام کی اطاعت بھی شامل ہے۔ معاملات میں بھی ہمارے مجموعی انحطاط کی وجہ سے یہ صورتِ حال ہو چکی ہے کہ حلال وحرام کا پیراڈائم مسلسل کمزور سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے ہم کراہت کی بنیاد پر اور شبہے کی اساس پر چیزوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے لیکن اب حرام سے ناگواری بھی کم لوگوں کو محسوس ہوتی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا سے حلال کا تعلق رکھنا طبیعت اور ذہن پر بوجھ بنتا جا رہا ہے اور جی چاہنے لگا ہے کہ کاش حلال وحرام کا قانون اتنا اٹل نہ ہوتا۔ یہ خواہش کل کلاں کو یہ روپ بھی اختیار کر سکتی ہے کہ، نعوذ باللہ، کاش اللہ نہ ہوتا، دین نہ ہوتا، شریعت نہ ہوتی۔ غرض ان تینوں درجاتِ ہستی میں، یعنی اللہ سے تعلق، انسان سے تعلق اور دنیا سے تعلق میں ہمارا جو مزاج بن گیا ہے وہ ایسی خود غرضی کا نتیجہ ہے جس میں مبتلا شخص کوئی روک ٹوک پسند نہیں کرتا، چاہے وہ دین کی طرف سے ہو یا معاشرے کی جانب سے۔ سچی بات یہ ہے کہ اللہ کی طرف مستقل یکسوئی تو بہت دور کی بات ہے ہم تو اللہ کے خیال سے بھی بے مزہ اور دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ دعا اللہ کے سامنے خود کو کھول دینے کا عمل ہے، اس میں بندہ اپنی حقیقی خواہشات کو اللہ کے حضور میں عرض کرتا ہے۔ ہماری دعا کا یہ حال ہے کہ یا تو بالکل لاتعلقی اور بے پروائی کے ساتھ کرتے ہیں یا پھر کسی وقت اپنے گناہوں کی بخشش طلب بھی کرتے ہیں تو اس طلب میں کوئی سنجیدگی اور

سچائی نہیں ہوتی، بس عام اور مبہم سی باتیں کر کے فارغ ہوجاتے ہیں۔ کبھی جزوی تفصیلات میں جاتے بھی ہیں تو ایسے گناہوں سے بچاؤ کی دعا کرتے ہیں جو ہمارے بس ہی میں نہیں ہوتے۔ مثلاً میں یہ دعا کرنے لگوں کہ یا اللہ مجھے ہٹلر اور چنگیز نہ بننے دینا، تو اس دعا کا کیا مطلب ہے! مجھ میں ہٹلر اور چنگیز خان بننے کی اہلیت ہے؟ اور اگر کبھی توبہ بھی کرتا ہوں تو اندر سے ڈر جاتا ہوں کہ کہیں رشوت لینا نہ چھوٹ جائے، فلم دیکھنا نہ چھوٹ جائے، نامحرم کی طرف رغبت کی نگاہ ڈالنے کی عادت نہ چھوٹ جائے۔ یعنی جو گناہ میری زندگی بن گئے ہیں اللہ کہیں انہیں نہ چھڑوا دے۔ گویا سب گناہوں سے تائب ہوتے ہوئے بھی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہوتا ہوں کہ یا اللہ وہ سب گناہ چھڑوا دے جو میں نہیں کرتا یا کرسکتا اور ان گناہوں کو جاری رہنے دے جو میں کرتا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں۔

توصورتِ حال یہ ہے کہ ہمارا تصورِ انسان، الا ماشاء اللہ، زندگی کی ایک انچ زمین پر بھی عملی حالت میں موجود نہیں رہا۔ ہمارا تصورِ انسان جیسا کہ عرض کیا کہ ہر حال میں، ہر خیال میں اور ہر سچویشن میں اللہ کی طرف یکسو رہنے والے بندے کا تصور ہے۔ اس بندے کی غلطی بھی اس یکسوئی میں اضافے کا ذریعہ بن جاتی ہے، گناہ بھی اللہ کا مقرب بننے میں بصورتِ استغفار مدد دیتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنے آپ کو ایسا بنالیا ہے کہ بہتری کا خواب بھی بے معنی ہوکر رہ گیا ہے۔ تاریخ ہمارے لیے زوال اور فنا کا مگرمچھ بن چکی ہے جس نے ہمیں اپنے جبڑوں میں جکڑ رکھا ہے۔ تو اس حالت میں نعرے بازی مضحکہ خیز ہے، اس حالت سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم نے اللہ سے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجتماعی بے وفائی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس جرمِ عظیم پر توبہ کرنی ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو گویا تجدیدِ عہد کرنی ہے۔ یا اللہ! مجھے معاف کردے، اب سے میرا جینا مرنا تیرے لیے ہوگا اور میرا سارا سفر تیرے حبیبِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر ہوگا۔

فرد بدل جائے تو تہذیب بدل جاتی ہے! اس یقین کے ساتھ مجھے اور آپ کو یہ عزم کرنا ہے کہ ہمارا ہر عمل یا تو اللہ کو خوش کرنے والا ہوگا یا تو اس کے غضب سے بچانے والا ہوگا، ہمارا ہر کام اللہ کے قریب لے جانے والا ہوگا، اس سے دور کرنے والا نہیں ہوگا۔ یہ ایک سادہ اور مختصر سا دائرۂ عمل ہے جو ہمارے اندر اور باہر کی دنیا کو حق کے زور سے، خیر کی طاقت سے اور جمال کی قوت سے تبدیل کرسکتا ہے۔ یہ لائحۂ عمل اختیار کریں پھر اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے گریں گے تو بھی منہ اللہ کی طرف ہی ہوگا۔ یہ بات سمجھ لیں کہ یکسوئی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک چلتے ہوئے آدمی کی یکسوئی جو شکر اور صبر کے ساتھ کامیابی سے راستا طے کرتا رہتا ہے، اور ایک مجھ ایسے کمزور شخص کی یکسوئی جو اسی راستے پر ہے مگر بار بار گر جاتا ہے اور گرتے وقت بھی اپنے معاف کردینے والے کی طرف یکسو ہے۔ یہ بھی استغفار کی برکت سے اپنے مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ تو ایسی یکسوئی جو کبھی کبھی کی غلطی اور گناہ سے بھی متاثر نہ ہو، اس کو اپنا حال بنا کر زندگی گزارنی ہے ورنہ ہم ایمانی موت مر چکے ہیں، بس تاریخی موت کا اعلان ہونا باقی ہے۔ اپنے آپ کو بدلنے کے اس عمل کا بالکل سادہ سا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ گناہ چھوڑ دو، گناہ چھوڑنے کی مخلصانہ، سنجیدہ اور مسلسل کوشش کرو۔ گناہ ہو جائے تو استغفار میں دیر نہ کرو، گناہ اور توبہ میں فاصلہ نہ رہنے دو۔ یہ چیز ان شاء اللہ ہمارے دینی اور روحانی بلکہ وجودی سفر کا حقیقی نقطۂ آغاز ہے، یعنی ترکِ معصیت دین دار بننے کا پہلا قدم ہے۔ اللہ کی نافرمانی چھوڑو اور اس میں کوئی بہانے بازی نہ کرو، خود رائی نہ کرو، اپنے آپ کو دھوکا مت دو اور اللہ سے فریب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ پہلا قدم اٹھ جائے تو دوسرا قدم یہ ہے کہ مجھے نیکی میں ترقی کرنی ہے۔ یعنی مجھے اللہ کو غضبناک کرنے والے کاموں سے بچنا ہے اور اسے خوش کرنے والے کاموں میں آگے بڑھتے رہنا ہے۔ بس یہی مقصدِ زندگی ہے اور یہی مزاجِ بندگی۔

گناہ صرف یہ نہیں ہے کہ میں نے جھوٹ بول دیا، گناہ صرف یہ نہیں ہے کہ میں

نے نشہ کرلیا، گناہ صرف یہ نہیں ہے کہ میں نے نماز قضا کردی۔ یقیناً یہ سب گناہ ہیں لیکن کچھ گناہ ایسے ہیں جو ان سے بھی بڑے ہیں، مثلاً حسد، مثلاً قدرت ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے کام نہ آنا، مثلاً دل آزاری، مثلاً حبِ دنیا وغیرہ۔ میرا پڑوسی مجھ سے خوش نہیں ہے، بیوی مجھے ظالم سمجھتی ہے، اولاد مجھے اداکار اور ریاکار جانتی ہے، دوست خودغرض کہتے ہیں، میرے ماتحت مجھے سخت دل اور خود پسند گردانتے ہیں تو یہ سب میری گناہ گاری کی زیادہ بڑی علامتیں ہیں۔ جو گناہ نفس کی conditioning کرتے ہیں وہ بڑے گناہ ہیں، صرف عمل تک محدود گناہ ان کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔ لیکن اب ہماری مذہبی تعلیم وتربیت کے نظام میں بھی یہ فکر نہیں رہ گئی کہ استاد اپنے شاگردوں کو تسلسل اور اصرار کے ساتھ اس طرف متوجہ کریں کہ دنیا کی محبت سے بچو، بڑائی کی طلب سے بھاگو، حسد سے پناہ مانگو، سنگ دلی سے اپنی حفاظت کرو! یہ سب ہمارے دینی موضوعات بھی نہیں رہ گئے۔ اب آپ بتایئے کہ یہ بحران کتنا بھیانک ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی اتباع دینی تعلیم وتربیت کے نظام کا بنیادی موضوع نہیں رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کی طرف سے بالکل بے رغبت تھے، انتہائی سخی تھے، نہایت حیادار تھے، تمام مخلوق میں لازماً، حتماً، قطعاً، یقیناً سب سے بڑے ہونے کے باوجود خود کو چھوٹا سمجھنے کی طرف مائل تھے۔۔۔ تو یہ جو فضائل ہیں، یہ جو اخلاق کے ستون ہیں اگر یہ میرے ذہن وطبیعت کے بنیادی تقاضے نہ بنیں تو میرے اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کوئی بنیادی نقص ہے۔ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نقص کا مطلب ہے دین میں کمی اور کمزوری۔ تو اس کا بڑا اہتمام رکھیں کہ مجھے عبادات میں بھی یکسو رہنا ہے اور معاملات میں بھی۔ نماز ایسی پڑھنی ہے کہ یہ عاجزانہ تسلی ہوجائے کہ اللہ کا شکر ہے کہ قیام کرلیا، اللہ کا فضل ہے کہ رکوع کرلیا، اللہ کی رحمت ہے کہ سجدہ کرلیا، کوئی جلدی نہیں کی، کوئی کسل نہیں دکھائی۔ اسی طرح میرے پڑوسی کو مجھ سے خوش رہنا چاہیے، میرے تمام متعلقین کو مجھ سے راضی رہنا چاہیے۔ اور یہ

حقوق بے نفسی اور خیر خواہی سے ہی ادا ہو سکتے ہیں۔

تو حاصلِ کلام یہ ہوا کہ دریا زہریلا ہو جائے تو مچھلی کو دریا کی صفائی کی فکر سے پہلے اپنے بچاؤ کا بندوبست کرنا چاہیے۔ ہم جس ہمہ گیر زوال کی لپیٹ میں ہیں، اس سے نکلنے کا ہر راستا اپنی اصلاح سے برآمد ہوتا ہے۔ فرد زندہ ہو جائے تو قوم بھی موت کے منہ سے نکل آتی ہے۔ ہمیں اس جذبۂ انقلاب کے ساتھ اپنا تزکیہ کرنا ہے اور خود کو دین کے مزاج اور مراد پر ڈھالنا ہے۔ خیال، حال اور عمل میں اللہ کی طرف یکسوئی کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل اتباع کو خوب جیتی جاگتی حالت میں برقرار رکھنا ہے۔ اس راستے پر چلنے کے لیے ترکِ غفلت، ترکِ معصیت اور نیکی میں ترقی کے جذبے کو اپنا زادِ راہ بنانا ہے اور اپنی تھکن اور کمزوری کو بھی اس سفر میں کارآمد بنانا ہے۔ گویا ہر حال میں اپنی فطرتِ بندگی میں صادق رہنا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق دے، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔ آمین۔

سوال: اخلاق کو اگر فطری کہا جائے تو اس سے آج کل خصوصاً مغرب میں یا مغرب سے متاثر ہونے والے مسلمان ملکوں میں بھی ایک خیال بہت پھیل رہا ہے کہ اخلاق کے لیے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں، تو اخلاق کو فطری کہہ کے ہم ان لوگوں کی تائید تو نہیں کر رہے جو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں ہے؟

جواب: بہت اچھا سوال ہے۔ اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ جب ہم کسی چیز کو فطری کہتے ہیں تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟ اور یہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ دینی سیاق وسباق میں فطرت کسے کہتے ہیں۔ ہماری روایت میں انسانی

فطرت باعتبارِ شعور اور فطرت بلحاظِ جبلت۔ سمجھ گئے ناں! ہماری فطرت کے دو حصے ہیں: ایک فطرتِ شعور ہے اور ایک حیوانی فطرت۔ جب یہ کہا جائے کہ اخلاق فطری ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اخلاق کا مادہ اور اچھائی کو پہچاننے کی صلاحیت فطرت باعتبارِ شعور میں رکھی ہوئی ہے۔ آدمی کو ہر اچھی بات کا علم نہیں ہے لیکن اس کا ذوق ضرور حاصل ہے۔ یعنی کوئی اچھائی سامنے آجائے تو آدمی کے اندر اس کی طرف کشش پیدا ہوتی ہے، پھر چاہے اس کشش پر عمل کرلیا جائے یا اس سے منہ موڑ لیا جائے۔ یہ انسان کا اختیار ہے کہ وہ اپنی فطرتِ شعور سے موافقت میں رہے یا مخالفت میں۔ اخلاق کو فطری کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اچھائی کا احساس اور اچھائی کی افادیت کا شعور انسان کو حاصل ہے اور یہ محض کسی خارجی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے۔ تاہم اخلاقی شعور کی نشوونما یقیناً تعلیم وتربیت اور ماحول سے ہوتی ہے۔ اگر آدمی کی طبیعت اور اس کا ماحول اخلاقی بناوٹ نہیں رکھتے تو انسان کی اخلاقی فطرت خود اس سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسانی فطرت دو دائروں میں ہے، شعور کا دائرہ اور جبلت کا دائرہ۔ اصل میں انسانی فطرت شعور ہی کا دائرہ ہے، فطرت کی جبلی سطح یا قانون حیوانی ہے۔ یہاں حیوانی کا مطلب حیواناتی نہیں ہے بلکہ حیاتیاتی ہے، یہ خیال رہے۔ تو انسانی فطرت اختیار کے ساتھ ہے کیونکہ باشعور ہستی لازماً free will کی حامل ہوتی ہے، اور حیوانی یا حیاتیاتی فطرت اختیار کے بغیر ہوتی ہے اور یہ ایک جبر کی طرح ہے جس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی یا جسے بدلا نہیں جاسکتا۔ انسان میں فطرت کا یہ جبر واختیار یکجا ہے۔ یہ یکجائی کہیں جبر کو غالب کر دیتی ہے اور کہیں اختیار کو۔ جبر یعنی جبلت کا غلبہ ہوجائے تو شعور یا اخلاقی وجود مغلوب اور معطل ہوجاتا ہے اور اگر شعور غالب آجائے تو حیوانی وجود اور اس کے داعیات اخلاقی اور نظریاتی گرفت میں رہتے ہیں۔ یہ فرق بتانا ضروری تھا تاکہ اخلاق کو فطری کہنے کی بنیاد سامنے آجائے اور یہ واضح ہوجائے کہ اچھے اخلاق وہبی

ہوتے ہیں اور انہیں عمل میں لانے اور شعور کی دیگر قوتوں سے متعلق رکھنے کے لیے باہر سے رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رہنمائی میسر نہ آئے تو فطری اخلاق اُن پودوں کی طرح ہوجاتے ہیں جنہیں پانی نہیں دیا گیا۔ جو لوگ مذہب کو نہیں مانتے اور اخلاق کو فطری کہتے ہیں وہ بھی اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ فطری ہونے کے باوجود اخلاق کو اپنی عملی تشکیل اور تکمیل کے لیے خارج سے کچھ تعلیمات اور قوانین کی ضرورت بہرحال ہوتی ہے۔

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جس طرح خدا کو مانے بغیر عقل اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی، جس طرح غیب کو شہود کی اصل جانے بغیر جمالیاتی شعور مکمل نہیں ہوسکتا، عین اسی طرح خدا کو اپنی مراد بنائے بغیر اور تعلق باللہ کو اپنا واحد محرک اور حقیقی غایت بنائے بغیر اخلاقی شعور یا اخلاقی وجود اپنی حقیقت کو نہیں پاسکتا۔ ظاہر ہے مغرب اس بات کو نہیں مانتا اور انسان کو خدا کے بغیر define کرنے پر مصر ہے۔ اس وجہ سے اور چیزوں کے علاوہ مغرب ایسے اخلاقی تضادات کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے جنہیں غیر فطری کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اور یہ تضادات صرف اخلاقی ہی نہیں، عقلی بھی ہیں۔ لیکن خیر، اس کی تفصیل میں کیا جانا، سرِ دست ہمیں اپنے تصورِ اخلاق سے اصولی واقفیت درکار ہے، یہیں تک محدود رہتے ہیں۔ ہمارا تصورِ اخلاق یہ ہے کہ انسان عقلی اور حیاتیاتی وجود ہونے کے ساتھ اخلاقی وجود بھی ہے۔ انسان کے اخلاقی وجود کو نظر انداز کر کے اس کے بارے میں قائم کیا جانے والا ہر تصور ناقص بلکہ مہمل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کا عقلی، حیاتیاتی اور اخلاقی وجود ہونا الگ الگ سمتوں میں نہیں ہے، بلکہ ایک دائرہ ہے جو ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور انہیں آپس میں مربوط رکھتا ہے۔ وہ دائرہ بندگی کا دائرہ ہے۔ یہی انسان کے تمام وجودی اصول کی واحد حقیقت اور واحد غایت ہے، اور یہی انسان کا مادۂ تعریف (substance of definition) ہے۔ گویا بندگی انسانیت کا سانچا ہے جس

میں اس کا اخلاقی، حیاتیاتی اور عقلی وجود ڈھلتا ہے۔تو روح چاہے اخلاقی ہو یا عقلی، وجود کی self internalization ہے جس پر قبل و بعد کا قانون وارد نہیں ہوتا۔ اس سطح پر شعور کہہ لیں یا وجود، ایک ہی بات ہے۔ خیر، یہ تو محض ایک جملۂ معترضہ تھا، جو بات ہم کہنا چاہ رہے ہیں وہ اتنی سی ہے کہ ہماری روایت میں اخلاق کے فطری ہونے کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ اخلاق خداداد ہیں، یعنی اللہ نے آدمی کو جس فطرت پر پیدا فرمایا ہے وہ اخلاقی ہے۔ اگر خدا کو نکال کر کوئی اخلاقی نظام بنایا جائے گا تو وہ مغرب کی طرح داخلی تضادات کا ملغوبہ بن کر رہ جائے گا۔ اخلاق کے موضوع پر میں کئی مرتبہ گفتگو کر چکا ہوں، امید ہے اس کے بنیادی نکات آپ کو بھی یاد ہوں گے، اس لیے فی الوقت اتنا ہی۔

سوال: نماز میں یکسوئی کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: ایک طریقہ عملی ہے اور دوسرا ذہنی اور قلبی۔ عملی طریقہ یہ ہے کہ گناہ سے بچو، اور باطنی طریقہ یہ ہے کہ اللہ سے غافل نہ رہو۔ یہ ہو جائے تو نماز ہی نہیں، پوری زندگی یکسوئی میں گزرتی ہے۔ گناہ سے بچنے کی کوشش اور اہتمام میں اللہ کا جو حضور میسر آتا ہے وہی نماز میں احسان کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ترکِ غفلت سے تعلق باللہ کا وہ زندہ ذوق حاصل ہوتا ہے جو نماز کے لیے بھی روح کا درجہ رکھتا ہے۔تو ترکِ معصیت اور ترکِ غفلت کو اپنا ایسا مقصود بنائیں کہ زندگی گزارنے کا ہر عمل اس مقصود تک پہنچنے کے لیے ہونے لگے۔ بس پھر یکسوئی ہی یکسوئی ہے، نماز میں بھی اور نماز کے باہر بھی۔ کیونکہ جو شخص نماز کے باہر اللہ کی طرف یکسو نہیں ہے، اسے نماز میں بھی یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔ آپ بس گناہ چھوڑنے کا عزم کر لیں، ان شاء اللہ غفلت سے بچنے کا سامان خود بخود ہو جائے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ گناہ چھوڑنے کو مقصدِ زندگی بنانے سے بندہ خود کو چھوٹا اور کمزور سمجھنے کا عادی ہو جاتا ہے، اور یہ چیز نفس کو انتہائی ناگوار ہے کیونکہ نفس تو اپنی بڑائی

چاہتا ہے اور دھوم دھام کے ماحول میں رہنا پسند کرتا ہے۔اب ظاہر ہے کہ ترکِ معصیت کے پراجیکٹ میں کوئی بڑائی اور دھوم دھڑ کا نہیں ہے، اس لیے اکثر لوگ یہ سوچنے اور کہنے سے شرماتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہم گناہ سے بچنے کی مسلسل کوشش میں لگے رہیں۔اپنے اردگرد بھی دیکھ لیں، کسی پیر صاحب کا انتقال ہوجائے اور آپ ان کے خلیفہ سے مریدوں کے مجمع میں تعزیت کرتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ اللہ پیر صاحب کی مغفرت فرمائے تو انہیں اچھا نہیں لگے گا، یا کسی عالم یا صوفی کو یہ دعا دی جائے کہ اللہ آپ کو گناہوں سے بچائے تو اکثر علما اور صوفیا اس دعا پر برا مان جائیں گے۔تو جناب، نفس ایسی ظالم اور مکار شے ہے کہ اللہ کے سامنے بھی معزز اور باوقار بن کر رہنا چاہتا ہے۔نفس میں سے بڑائی کی یہ ہوس نکالے بغیر بندگی کے لازمی احوال نصیب ہوجائیں، یہ ناممکن ہے۔اس کی یہ اکڑ جو نماز ہی نہیں پوری زندگی کو دھوکا بنا دیتی ہے، صرف ترکِ معصیت کے عزم سے ختم ہوگی۔ میں تو کہتا ہوں کہ ابتدائے کار میں بس گناہ چھوڑنے کے عزم پر ثابت قدم رہنا چاہیے، ترکِ غفلت کے عنوان کو بھی ایک مناسب وقت آنے تک معطل رکھنا چاہیے کیونکہ نفس ترکِ غفلت کی آڑ لے کر خودنمائی اور خودستائی کے راستے نکال لیتا ہے۔تو بس مجھے گناہوں سے بچنا ہے اور اپنے بچاؤ کی مجاہدانہ کوشش کو آخری سانس تک جاری رکھنا ہے۔ گناہوں سے حفاظت کی ضرورت مرید کو بھی ہے اور شیخ کو بھی، شاگرد کو بھی ہے اور استاد کو بھی، ان پڑھ کو بھی ہے اور عالم کو بھی، گناہ گار کو بھی ہے اور نیکوکار کو بھی۔ ان شاء اللہ وہ وقت بھی جلد آجائے گا جب ہم یہ محسوس کرلیں گے کہ غفلت گناہوں کی جڑ ہے، گناہ گاری سے بچنے کے لیے اسے کاٹنا ضروری ہے۔

سوال: نماز بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے، کیا قرآن کی آیت یہ نہیں بتاتی کہ نماز میں یکسوئی پہلے ہے اور گناہوں سے بچنا اس کا نتیجہ؟

جواب: نماز کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کی طرف یکسوئی کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز۔ اس لیے یکسوئی، ظاہر ہے کہ پہلے ہے۔ باقی یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ نماز یقیناً گناہ سے بچاتی ہے اگر اسے گناہوں سے بچنے کی فکر اور کوشش کے ساتھ پڑھا جائے۔ نماز فرض ہونے کی عمر وہی ہے جب گناہ وثواب کا قانون نافذ ہوجاتا ہے، تو جو اس وقت نمازی ہوگیا وہ گناہ سے بچ گیا۔ سب سے پہلے تو ترکِ صلاۃ کے گناہ سے بچ گیا، پھر نماز کو نماز کی طرح سے پڑھنے کی برکت سے گناہ سے بچنے کی خواہش اور توفیق بھی حاصل ہوگئی۔ نماز ایسے ناشکروں کو گناہ سے نہیں بچاتی جو اسے اہمیت نہ دیتے ہوں اور گناہ سے بچنا ان کے لیے مرنے جینے کا مسئلہ نہ ہو۔ یہاں میں ایک کام کی بات عرض کرتا ہوں، اس کا خیال رکھا جائے تو ان شاء اللہ نماز بھی اچھی ہوجاتی ہے اور اس کی برکت سے بے حیائی اور منکرات سے بچنے کی توفیق بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ زندگی کے سارے معانی اس چیز میں ہیں کہ آدمی گناہ سے بچتا رہے اور نیکی میں ترقی کرتا رہے۔ تو گناہ سے بچنا ہے تو کسل یعنی سستی اور کاہلی سے بچو اور نیکی میں ترقی کرنی ہے تو بخل کا علاج کرو۔ تو لینے میں چست ہونا چاہیے اور دینے میں فیاض۔
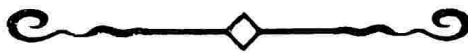
حسد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

دعوت اور نصیحت کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی بڑی اور غیر معمولی بات کہنی ہوتی یا کسی خاص حوالے سے دین کا مجموعی مقصود بیان فرمانا ہوتا تو دو طرح کی باتوں کو ایک دوسرے کا لازم وملزوم بنایا کرتے تھے، اللہ اور آخرت پر ایمان اور دوسرا حسنِ اخلاق۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں جنت میں جانے کی لازمی شرط کے طور پر بیان فرمایا کرتے تھے۔ یعنی ان کی بنیاد پر آدمی کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دی ہوئی بشارت کے مطابق وہ شخص جنتی ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہے اور اخلاقی اعتبار سے مسلم معاشرت کا اچھا اور فعال حصہ بننے میں کامیاب ہے۔ ہمیں یوں سمجھنا چاہیے کہ آخرت کے لیے جد و جہد خود مجھے جنت میں لے جائے گی اور اپنے اخلاقی وجود کی تکمیل کا عمل دوسروں کو بھی جنت میں رکھے گا۔ کبھی محسوس کر کے دیکھیے کہ جنت دراصل حسنِ معاشرت کا ideal ہے جس میں بنیادی سکون اس بات سے میسر آئے گا کہ دیکھو دوسرے کتنے اچھے ہیں، کتنے محبتی ہیں اور کتنے خوش ہیں۔ اس لیے جنتیوں جیسی زندگی محض انفرادی نہیں ہوتی بلکہ تعلق کے ذوق اور شعور کے ساتھ اجتماعی

ہوتی ہے۔ جنت کا اشتیاق سچا ہو تو آدمی دنیا میں بھی ایک جنتی پن پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے، یعنی دنیا کو بھی ایک ایسی معاشرت میں ڈھالنے کی سعی ضرور کرتا ہے جس کی اساس اللہ کی حضوری کے احساس پر ہو۔ وہ حضوری جو فرد اور معاشرے کو حق، خیر اور حسن سے سیراب اور شاداب رکھتی ہے۔ لوگ اگر جنت میں جانے کا شوق رکھتے ہوں تو ان کی معاشرت کا ماحول جنت جیسا ہی ہوگا اور دنیا میں بھی اس حضور و سرور کا ایک قابلِ اعتبار تجربہ حاصل ہو جائے گا جو اہلِ جنت کا مستقل حال ہے۔ حضور اللہ کا اور سرور اللہ کی نعمتوں کا، دوسروں کے ساتھ مبنی بر محبت تعلق کا۔

اللہ کو سچائی سے مان لیا جائے تو اس کے کچھ نتائج زندگی میں ضرور نکلتے ہیں۔ مثلاً ذوقِ عبادت اور حسنِ اخلاق۔ ایمان میں سچائی درحقیقت تعلق باللہ کے تجربے سے پیدا ہونے والا حال ہے جو آدمی کے سارے نظامِ تعلق کو درست اساس اور صحیح رخ پر رکھتا ہے۔ اور یہی حسنِ اخلاق کہ اپنی خوشی دوسروں کی خوشی سے مشروط ہو جائے اور اپنا دکھ دوسروں کے دکھ کا عکس بن جائے، اس پس منظر میں آج مجھے ایک ایسی چیز پر بات کرنی ہے جو ایمان اور اخلاق دونوں کے لیے مہلک ہے۔ یہ ایک مرض ہے جو دنیا پرستی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے ہمارے اندر بہت پھیل چکا ہے۔ یہ دنیا پرستی اتنا بڑا عذاب ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ کے ساتھ تعلق بھی مجروح ہو چکا ہے اور ہمارا آپس کا نظامِ تعلق بھی دیمک کھائی ہوئی لکڑی کی طرح بن چکا ہے۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ زندگی میں کامیابی اور خوشحالی کا ہر دروازہ دنیا پرستی کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد ہی کھلتا ہے۔ جدید زندگی اور اس کی اقدار نے ہماری صلاحیتِ تعلق، قوتِ اخلاص اور طاقتِ ایثار سب کو کمزور کر دیا ہے۔ اور اس ہمہ جہت اخلاقی کمزوری کا تجربہ ہم میں سے ہر شخص کو ہے۔ ایسے صاحبانِ ہمت بہت کم ہیں جنہوں نے خود کو اس تجربہ کے گرم تنور سے باہر نکال لیا ہو۔ جدید دنیا، اس کے ادارے اور اس سے پیدا ہونے والا مزاج دین ہی کے

لیے چیلنج نہیں ہے بلکہ آدمیت کے لیے بھی سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ویسے دین اور انسانیت میں کوئی ایسا فاصلہ نہیں ہے جس کی بنیاد انہیں دو چیزیں تصور کیا جائے، لیکن کچھ اہلِ دین کہلانے والوں کی غیر ذمہ داری سے اور کچھ جدیدت کے وکیلوں کی منظم جدو جہد سے یہ دونوں اب دو الگ الگ چیزیں بن گئے ہیں۔ بہرحال، اس وقت غازیانِ بدر و حنین جیسے عظم کے ساتھ اس خطرے کے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ ہمیں اندر سے مسمار کر رہا ہے اور ظاہر کو رنگین کر کے، ہماری زندگیوں میں طرح طرح کی راحتیں اور آسائشیں داخل کر کے ہمارے دل کو ویران کر رہا ہے۔ دل کی معموری، دل کی روشنی اور دل کی زندگی کا دار و مدار محض اور محض تعلق باللہ پر ہے۔ دل ان معنوں میں جوہرِ تعلق ہے اور اسی جوہرِ تعلق سے پھوٹنے والی محبت، معرفت اور خشیت کی روشنیاں ہمارے وجود میں کسی اندھیرے کو جگہ نہیں بنانے دیتیں۔ اللہ سے تعلق کی روح سے زندہ وجود ہمارا وہ ideal ہے جس کی کارفرمائی سے انفرادیت بھی مستند انداز سے تشکیل پاتی ہے اور اجتماعیت بھی حقیقی طور پر تعمیر ہوتی ہے۔ یہ تعلق باللہ ہی ہے جو ہماری شخصیت کو اس طرح condition کر دیتا ہے کہ ہم اللہ کے آگے غرض مند رہتے ہیں اور لوگوں کے لیے بے غرض، اللہ کے حضور میں ہم لینے والوں کا مزاج رکھتے ہیں اور لوگوں کے درمیان دینے والے کی طبیعت۔ جدید دور میں ہماری نفسیات کو بھی اس حوالے سے اتنا مسخ کر ڈالا ہے کہ اب اپنی آدمیت کے بالکل معمولی مطالبات کی تکمیل بھی مشکل ہوگئی ہے۔ ہمارے درمیان ایک ایسی دوڑ کا میدان بچھا دیا گیا ہے اور کامیابی کا ایک بت گاڑ کر مسابقت کا ایسا حیوانی رویہ پیدا کر دیا گیا ہے جسے ہم سمجھنے کے لائق ہوتے ہیں تو اس وقت تک اس کی اصلاح کا وقت گزر چکا ہوتا ہے، اس سے نکلنے کے دروازے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ڈوبتا ہوا آدمی جتنی بھی سانسیں لے گا وہ دراصل موت کا تنفس ہوں گی۔ زندہ رہنے کی کوشش اس کی موت کو مزید نزدیک لے آئے گی۔ غرض کامیابی کے حصول کی ایک

مجنونانہ دوڑ لگی ہوئی ہے کبھی دنیا کے نام پر اور کبھی دین کے نام پر۔ بس مجھے ہر قیمت پر دوسروں سے آگے نکلنا ہے، یہ مزاج مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک اور بازاروں سے لے کر مسجدوں تک عام ہوتا جا رہا ہے۔ چلو دنیا پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر آدمی ریس کا گھوڑا بن جائے تو یہ زیادہ حیرانی کی بات نہیں ہے لیکن دین کی آڑ لے کر شکاری کتوں کی دوڑ میں شامل ہو جانا بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے بھی دین کا کام کرنا ہے اور آپ کو بھی اسی دین کی خدمت کرنی ہے، لیکن مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں ہے کہ میں بھی کامیاب ہو جاؤں اور آپ بھی سرخ رو ہو جائیں۔ میری زیادہ دلچسپی اس چیز سے ہے کہ آپ کو کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپ کی وجہ سے لوگ میری طرف متوجہ نہیں ہو رہے لہذا کسی بھی طرح سے آپ کی غلطی ثابت ہو جائے تا کہ لوگ میری طرف آنے لگیں۔ میرا جواز آپ کی غلطی سے مشروط ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ ایک عام رویہ بن گیا ہے، ہر طرف نفسا نفسی مچی ہوئی ہے۔ ایسے ماحول میں کیسا ایمان اور کہاں کا اخلاق! ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جنون یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ میرا قد بھی آپ سے لمبا ہونا چاہیے، میری صحت بھی آپ سے اچھی ہونی چاہیے، میری صورت بھی آپ سے بہتر ہونی چاہیے، میری آمدنی بھی آپ سے زیادہ ہونی چاہیے اور میری شہرت بھی آپ سے بڑھ کر ہونی چاہیے۔ بلکہ مجھے رشوت بھی آپ سے زیادہ لینی چاہیے اور میرے مقتولوں کی فہرست بھی آپ سے لمبی ہونی چاہیے۔ یعنی صرف اچھائی ہی نہیں برائی میں بھی مجھے آپ پر سبقت لینی چاہیے۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہوتی، میں نے خود کچھ ایسے لوگ دیکھ رکھے ہیں جو اس بات پہ پریشان ہو جاتے ہیں کہ کوئی ان سے زیادہ ناکام ہے اور ان سے زیادہ بیمار ہے۔ وہ ناکامی اور بیماری میں بھی کسی کو اپنے آگے دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسی شخصیت کا تجزیہ انسانی معیارات پر کیا جا سکتا ہے؟ اپنے انسان ہونے کی طرف سے مسلسل غفلت نے ہماری بچی کھچی انسانیت کو

بھی ہمارے لیے ناگوار بنا دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورتِ حال سے نکلنے کا کون سا راستا اختیار کیا جائے۔ لیکن بہرحال اگر راستا مل بھی گیا تو بالکل virgin ہوگا اور اس پر ہمارے نشانِ قدم تو ہرگز نہیں ہوں گے۔

جس مرض کا میں ذکر کر رہا تھا وہ اس صورتِ حال کا موجد بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ اور وہ ہے حسد کا مرض۔ ظاہر ہے کہ جب ہمارے درمیان مسابقت کی فضا ہی خودغرضی اور حیوانیت پر قائم ہوگی تو ہم دوسروں کو اپنے تھوڑا پیچھے نہیں بلکہ بہت پیچھے دیکھنا چاہیں گے۔ ہم ایک ایسی دوڑ میں شامل ہیں کہ ہم سے آگے اگر کوئی ہیولہ اور دھندلا سا خاکہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ لازماً قابلِ نفرت ہے۔ اب یہ ہمارا مزاج بن چکا ہے۔ حسد تعلق کی مکمل نفی ہے۔ حسد اتنی تباہ کن چیز کہ حاسد سے اس کی خوبیاں پوچھی جائیں گی نہ اس میں خرابیاں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک خرابی ہی اس کے مکمل طور پر خراب ہونے کا کافی ثبوت ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس مفہوم میں ارشاد فرمایا کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو۔ یعنی اس کی موجودگی میں نیکیاں چاہے جتنی بھی ہوں، بے نتیجہ اور ناقابلِ اعتبار ہوں گی۔ یہ ایسی دیمک ہے جو نیکی کے بڑے سے بڑے structures کو چاٹ جاتی ہے۔ اسی حدیث شریف سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ حسد کی موجودگی میں نیکی محض خام خیالی ہے اور حاسد آدمی نیک ہو ہی نہیں سکتا۔ نیکی بظاہر کچھ اچھے کام کر کے فارغ ہو جانے کا نام نہیں ہے، نیکی محض form نہیں ہے content بھی ہے، نیکی صرف فعل نہیں ہے مزاج بھی ہے اور نیکی فقط عمل نہیں ہے نیت بھی ہے۔ اخلاق طبیعت میں سرایت کر کے اعمال کے محرک بن جائیں تو یہ نیکی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو نیکی اللہ کے ساتھ تعلق میں سچائی کا مجموعی حال اور مزاج ہے۔ نیک آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت، خشیت اور فرمانبرداری کے جذبے سے رہتا ہے اور اس کے ساتھ بلکہ اس کی بنیاد پر لوگوں اور چیزوں کے ساتھ بھی وہی مزاجِ تعلق اور نظمِ تعلق

رکھتا ہے جو اللہ کو پسند ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ نیکی ذوقِ تعلق ہے، تعلق باللہ کا ذوق اور تعلق بالخلوق کا ذوق۔ اسی لیے نیکی عابدانہ اور متواضعانہ ہوتی ہے۔ حسد نیکی کے دونوں ستونوں کو کھا جاتا ہے۔ یہ اللہ سے تعلق کے قابل بھی نہیں رہنے دیتا کیونکہ حاسد ہمیشہ ناشکرا ہوتا ہے۔ جس کے دل میں حسد جڑ پکڑ لے اسے شکر کی توفیق نہیں ملتی، اور جسے شکر کی توفیق نہ ملے وہ تمام نیکیوں کے واحد ماخذ یعنی بندگی کی اولین شرط سے محروم ہے۔ شکر بندگی کی پوری عمارت کا سنگِ بنیاد ہے اور بندے کی طرح رہنے کا سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ اللہ کے شاکر بن کر رہو۔ اس کے نعمتیں دینے پر بھی شکر گزار رہو اور اس کے نعمتیں نہ دینے پر بھی شکر گزار رہو۔ کیونکہ بندگی کی کائنات کا سارا نظامِ حرکت شکر پر چل رہا ہے۔ ناشکرے کی عبادت بھی محض جسم ہے روح سے خالی۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ حاسد شخص شکر سے محروم تو ہوتا ہی ہے، اللہ سے شکایت رکھنے کا مریض بھی بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ناشکری شکایت تک ضرور پہنچتی ہے اور حاسد آدمی حسد کے ساتھ ساتھ اللہ کی شکایت سے بھی بھرا ہوتا ہے۔

جو کبھی پڑھا تھا نہ سنا تھا، وہ اس دور میں اپنی شامتِ اعمال سے دیکھا ہے کہ اب حسد کے لیے مفادات کا ایک ہونا اور میدانِ کار کا مشترک ہونا ضروری نہیں رہ گیا۔ حسد مشترک career رکھنے والوں کے درمیان ہوا کرتا تھا، اب معاملہ یوں نہیں رہ گیا۔ اب مجھے خلا باز سے بھی حسد ہے حالانکہ میری زندگی میں کوئی امکان نہیں ہے راکٹ پہ بیٹھنے کا اور چاند پر چہل قدمی کرنے کا۔ اور مجھے ضعیفی کی عمر میں ہیوی ویٹ باکسنگ کے عالمی چیمپئن سے بھی حسد ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ حسد ضروری اور فطری خود شناسی سے بھی محروم کر دیتا ہے اور حاسد کے اندر خود اپنا تصور باندھنے کی صلاحیت مسخ ہو جاتی ہے۔ دورِ جدید میں چونکہ فرد کے لیے کوئی ایسا اخلاقی ideal نہیں رہ گیا ہے جو واقعی اور عملی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں آدمی کی رہنمائی کرے، اس لیے آج کے فرد کا خود اپنے بارے میں

تصور بہت سکڑا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مہمل حد تک تجریدی بھی ہے۔ شخصیت کسی ideal یا کسی بنیادی مسلمہ تصور کی روشنی میں جبلت اور شعور کے productive تال میل سے بنتی ہے، جدید آدمی اس تال میل سے خالی اور بے خبر ہے۔ اس کا وجود اتنی شدت کے ساتھ جبلی بن چکا ہے کہ اس وجودی سطح سے ہم آہنگ رہنے کے لیے ذہن کی ساری فعلیت بس اتنی رہ گئی ہے کہ جبلت اور جبلی داعیات کی تجرید کرتا رہے۔ اور ظاہر ہے کہ جبلت یعنی آدمی کا حیوانی وجود پیاس سے بھاگتا ہے اور سیرابی کی طرف لپکتا ہے۔ کیونکہ بڑے مقاصد پیاس کو بھڑکاتے ہیں اس لیے آج کا جبلی آدمی ان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس آدمی نے تمام بڑے تصورات مثلاً خوشی مثلاً آزادی مثلاً انسان کی اصلی ساخت کو بدل کر انہیں جبلی context دے دیا۔ اب تصورِ انا بھی اور آدمی کے اندر 'میں' ہونے کا احساس بھی ایک طبعی کیفیت تو رکھتا ہے لیکن اس معنویت سے عاری ہے جو شخصیت کی مسلسل تجدید و توسیع کرتی رہتی ہے۔ اب انا کے wardrobe میں بس ایک ہی جوڑا رہ گیا ہے جسے آدمی پہنتا اور اتارتا رہتا ہے۔ آج کا آدمی اول تو داخلیت رکھتا ہی نہیں ہے اور اگر کہیں اپنے اندر جھانکنے پر مجبور ہو جائے تو وہاں خلا اور اندھیرے اور دھند کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ داخلیت اگر تاریک خلا بن جائے تو وہاں حسد کا پودا ہی پروان چڑھ سکتا ہے، ویسا ہی حسد جس کی طرف ابھی اشارہ کیا کہ حاسد اور محسود میں زیادہ چیزیں ایسی ہیں جو مشترک نہیں ہیں۔

ہم میں سے ہر شخص یہ دیکھ رہا ہے کہ اب حسد قریبی رشتوں میں بھی داخل ہو گیا ہے۔ بھائی بہنوں کا حسد تو اب عام چیز بن چکی ہے، باپ بیٹوں کا حسد بھی سننے میں آتا ہے۔ رشتوں میں ایسی دڑاریں پیدا ہو گئی ہیں کہ کبھی خیال آ جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ حسد تو نہیں ہے تاہم رشتوں کا بھیانک بحران ضرور ہے کہ اب مائیں اپنی اولاد میں فرق کرنے لگی ہیں۔ جو لڑکا زیادہ کماتا ہے، اس سے زیادہ محبت ہے اور جو کم

کما تا ہے اس سے یا تو کم محبت ہے یا بالکل نہیں۔ حسد اور رشتوں کے اس بحران کے اسباب یکساں ہیں۔ بھائی! پہلے بھی ماں باپ اپنی اولاد میں ترجیح کا رویہ رکھتے تھے۔ ایسا صحابہ کے دور میں بھی نہیں تھا کہ دس بچے ہیں تو وہ دس کے دس ایک ہی درجے میں محبوب ہوں۔ کچھ سے زیادہ محبت ہوتی تھی اور کچھ سے کم، لیکن بنائے محبت واضح تھی۔ وہ بچہ ماں باپ کو زیادہ محبوب ہوتا تھا جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے زیادہ محبت رکھتا تھا۔ بلکہ یوں کہہ لیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا زیادہ محبوب ہوتا تھا۔ اس ترجیح سے یہ پتا چلتا ہے کہ جو اولاد والدین کے مقصودِ زندگی سے زیادہ قریب ہو گی، وہی انہیں زیادہ محبوب ہو گی۔ یہ بالکل فطری بات ہے۔ لیکن اب مقصود بدل گیا ہے، محبوب بدل گیا ہے۔ اب دنیا ہی مقصود ہے، دنیا ہی محبوب ہے اور دنیا ہی معبود ہے۔ اولاد میں سے جو بھی دنیا سے زیادہ قریب ہے اور ہمیں بھی قریب رکھتا ہے، وہ ہمیں زیادہ محبوب ہے۔

تو خیر، حسد کا پہلا مرحلہ ہے دوسرے کی کامیابی کا برا لگنا۔ یہ حسد کے خبیث درخت کا بیج ہے۔ میں اور آپ ایک جگہ انٹرویو دینے گئے، آپ منتخب ہو گئے، میں نہیں ہوا۔ اب مجھے اپنے منتخب نہ ہونے کا افسوس کم ہے اور آپ کی کامیابی کا رنج زیادہ۔ میں اپنی ناکامی تو برداشت کر لیتا ہوں مگر مجھ سے آپ کی کامیابی برداشت نہیں ہو رہی۔ یہ صورتِ حال ہو تو مجھے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ حسد کا بیج میرے دل میں پڑ گیا ہے۔ اس بیج کو اگر اسی وقت نہ نکال پھینکا تو پھر میری ساری عمر حسد کے پیڑ کی زہریلی چھاؤں میں گزرے گی۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ میرے اندر یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ انٹرویو میں کامیابی کے باوجود آپ کو تقرری کا خط نہ ملے اور آپ اپنی کامیابی کا پھل نہ کھا سکیں۔ اب حسد کا بیج پودا بن چکا ہے۔ اب اگر میری یہ خواہش پوری ہو جائے تو مجھے ایسی خوشی محسوس ہو جو اپنی کامیابی پر بھی نہ ہوتی ہو۔ یہ حسد کا تیسرا مرحلہ ہے، یہاں حسد مکمل ہو جاتا ہے۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ آدمی دوسروں کے بارے میں اس طرح کا جذبہ اور

رویہ رکھتا ہو تو وہ کسی بھی طرح کے تعلق کا اہل رہ جاتا ہے؟ تو مختصر یہ کہ حسد نام ہے خود غرضی کی شدت کی وجہ سے دوسرے کے نقصان کو محبوب رکھنے کا۔ یعنی میرا فائدہ دوسرے کے نقصان سے مشروط ہو جائے۔ اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔

حسد مزاج کی برائی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے خون میں کوئی زہریلی چیز گردش کر رہی ہو تو زہریلا پن پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک ایک جیسا رہے گا۔ اس لیے یہ خرابی پوری شخصیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس کی زد صرف دو چار اعمال پر نہیں پڑتی، اس کے نتیجے میں میرا عمل اچھا دکھائی دینے کے باوجود مبنی بر شر ہو جاتا ہے۔ اب چاہے میں خدمتِ خلق کروں یا وعظ کہوں یا درس دوں یا سجدہ کروں، یہ سب کا سب ایک زہریلے وجود کا اظہار بن کر رہ جائے گا۔

شکر کے بارے میں ابھی کچھ بات کی تھی، شکر بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔ تمام نیکیوں میں معنی اسی سے پیدا ہوتے ہیں اور حسد کا علاج بھی اسی سے ہو گا۔ شکر گزاری محض یہ نہیں ہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے دیا، اس پر تیرا شکر ہے۔ پوری شکر گزاری یہ ہے کہ یا اللہ! مجھے نہ دیا، کسی کو تو دیا۔۔۔ اس پر بھی تیرا شکر ہے۔ یعنی اللہ کے نعمت دینے کے عمل کو دیکھ لینا بھی موجبِ شکر ہے، اور پھر اس عمل میں خود کو بھی شامل دیکھنا، یہ بھی باعثِ تشکر ہے۔ اب مجھے پتا نہیں ہے کہ اس میں سے کون سا شکر زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتا ہے تہِ دل سے۔ مجھے یہ پتا لگانا مشکل ہو جائے تو میں واقعی شکر گزار بندہ ہوں۔ اسی طرح مجھے ایک تکلیف ہے اور آپ بھی کسی تکلیف کا شکار ہیں۔ میری حالت بگڑتی جا رہی ہے مگر آپ ٹھیک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں اگر میرے دل سے یہ آواز نکلے کہ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تیرے فضل سے فلاں صاحب کی تکلیف دور ہو گئی، سچ ہے کوئی تکلیف تیرے دستِ رحمت اور دائرۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ تیرا شکر ہے کہ تو نے اس حقیقت کو مجھے بھی دکھا دیا۔ تو سمجھ گئے ناں کہ شکر کی اساس اس یقین پر ہے

کہ سب نعمتیں اللہ دیتا ہے، چاہے وہ نعمتیں میرے حصے میں آئی ہوں یا نہ آئی ہوں۔ تو جو شخص دوسروں کی کامیابی کو اس طرح نہیں دیکھتا کہ گویا اس کی کامیابی نے مجھ پر شکر واجب کر دیا ہے، وہ بھلا آدمی نہیں ہے۔ ایک دوست کامیاب ہوتا ہے تو سب دوستوں پر شکر واجب ہو جاتا ہے، ایک بیمار اچھا ہو جائے تو سب بیماروں کو شکر ادا کرنا چاہیے اور ایک نادار مالدار ہو جائے تو سب ناداروں کو الحمد للہ کہنا چاہیے۔

حسد کا جو علاج بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کی کامیابی یا خوشی یا خوشحالی یا بلند استعدادی یا ناموری یا مقبولیت ناگوار گزرنے لگے تو اسی وقت دعا کی جائے کہ یا اللہ اس شخص پر اور فضل فرمایئے، اسے اور آگے لے جایئے۔ ایسی دعا کی عادت ڈال لی جائے تو انشااللہ حسد کا مادہ نفس سے نکل جائے گا، طبیعت سے خارج ہو جائے گا۔ جس سے حسد محسوس ہو یا حسد کا اندیشہ ہو، اس کی لوگوں میں تعریف کرنے سے بھی آدمی حاسد بننے سے بچ سکتا ہے۔

سوال: غیر مسلم سے حسد رکھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: حسد خودکشی کا عمل ہے، چاہے مسلمانوں کے درمیان رہ کر کیا جائے یا غیر مسلموں کے درمیان۔ جیسے چوری غیر مسلم کے گھر میں بھی کی جائے تو چوری ہی ہے، اسی طرح حسد بھی ہر صورت میں حسد ہے۔ یہ یاد رکھیے گا کہ حسنِ معاشرت دین کا بڑا مقصود ہے۔ یہ مقصود غیر مسلموں سے مبالغے کے ساتھ حسنِ سلوک کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ حسد چونکہ اچھی معاشرت کی موت ہے اس لیے مسلم ہو یا غیر مسلم، حسد کسی سے نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: آج کی معاشرت میں دینداری پر قائم رہنا کس طرح ممکن ہے؟

جواب: ایک بات کا مجھے یقین ہونا چاہیے کہ میرے اندر اور باہر کے حالات چاہے جیسے بھی ہوں، میرا دین مجھ سے جو طلب کر رہا ہے وہ ہر صورت میں قابلِ عمل ہے۔ بس اس یقین پر قائم ہو جائیں۔

مجاہدہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمۂ قرآن سچ پوچھیں تو ایک کرامت ہے۔ اس سے بڑی کرامت کا ظہور کم ازکم ہندی مسلمانوں میں نہیں ہوا، اور خود اردو زبان پر اس ترجمے سے بڑا احسان کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ایک الہامی ترجمہ معلوم ہوتا ہے جس کی ایک تاثیر یہ ہے کہ اگر اسے سمجھ کر پڑھا جائے تو قرآن کے دقیق مقامات خود بخود کھلتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں اور تفسیریں کھولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ میرا یہ کئی مرتبہ کا تجربہ ہے کہ قرآن کی جو بات شاہ صاحب کے ترجمے سے کھل جاتی ہے، وہی بات کسی اچھی سے اچھی تفسیر میں بھی دیکھی جائے تو وہاں اس بات کی جامعیت اور گہرائی compromise ہوجاتی ہے۔ یہ شعر ان کے ترجمۂ قرآن کی ہی مدح میں لکھا گیا تھا:

خاطرِ پاک تھی احمد کی خدا کو منظور
ورنہ قرآن اترتا بزبانِ دہلی

اس ترجمے کے علاوہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "مُوضح القرآن" کے عنوان سے تفسیر بھی

لکھی تھی جواب شاید نایاب ہے، اور یہی عنوان ان کے حواشی اور فوائد کا ہے جو ترجمے کے ساتھ چھپتے ہیں۔ ان حواشی میں ایک مقام پر، جو مجھے یاد نہیں آرہا، ایک فقرہ لکھا ہے جسے میں نے کوئی چالیس برس پہلے دیکھا تھا اور آج تک بھولا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں جن باتوں کا سب سے زیادہ اثر ہوا ہے ان میں یہ فقرہ بھی شامل ہے۔ پڑھتے ہی یہ احساس ہوا تھا کہ جیسے مجھے میری زندگی کا مقصد مل گیا ہے بلکہ اپنے وجود کی حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے: ''دینِ اسلام کا اول کچھ مشقت ہے، آخر راحت ہی راحت ہے''۔ یوں لگا جیسے پورا دین مل گیا اور بندگی کا پورا تصور حاصل ہوگیا۔ اس فقرے نے جیسے میرے نفس میں مزاجِ دین inject کردیا۔ یہ فقرہ یقیناً کسی ایسی ہستی ہی کا ہوسکتا ہے جو قرآن و دین کے ظاہر و پوشیدہ پہلوؤں کا عملی تجربہ کرچکی ہو اور اس دین کی مراد میں اور اس کی حقیقت میں غواصی کر کے نکلی ہو۔ اب وہ گویا ہم ایسے نالائقوں اور نااہلوں کو اپنے اس تجربے کا خلاصہ بتا رہی ہے۔

اس مبارک فقرے کی روشنی میں عرض کرتا ہوں کہ دین نام ہے اللہ کو مان کر اس کی عبادت و اطاعت کو پوری ذمے داری سے نبھانے کا۔ دین پہلے ہی قدم پر یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہر حکم کو بلا چون و چرا مانو، اس پر خلوصِ نیت کے ساتھ عمل کرو اور اس کی تعمیل کی بہترین صورت اور بہترین حالت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے حکم پر مارے باندھے اور حالتِ جبر میں عمل کیا جائے۔ وہ اپنے ناچیز بندوں سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے ہر حکم پر بہترین صورتِ تعمیل اور بہترین حالتِ تعمیل کے ساتھ عمل کیا جائے۔ یعنی دل کی آمادگی کے ساتھ، نیت کے اخلاص کے ساتھ، اللہ کی طرف عاجزانہ یکسوئی کے ساتھ اور تعمیل کی مسنون صورت کے ساتھ۔ حکم کا اصل مدعا ترکِ معصیت ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو تعمیلِ حکم کے مطالبات پورے کرنے میں محنت پڑتی ہے اور اندر باہر کچھ رکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں۔ یہ

محنت ومشقت آدمی قبول کرلے اور تعمیلِ حکم پر راضی ہی نہیں بلکہ کمر بستہ ہو جائے اور پورے عزم کے ساتھ یہ طے کرلے کہ مجھے اللہ کی فرماں برداری میں کچھ محنت، مشقت اور زحمت سے گزرنا پڑے گا جو میں گزروں گا۔ تعمیلِ حکم میں وہ چیزیں بھی چھوڑ دوں گا جو نفس کو مرغوب ہیں اور وہ چیزیں بھی اختیار کروں گا جو نفس کو ناگوار ہیں۔ نفس کے کسی ایسے تقاضے پر کان نہیں دھروں گا جو اللہ کے حکم کی تعمیل کے خلاف ہو، اور اس معاملے میں شیطان کی طرف سے پیدا کی جانے والی کسی کشش کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ یہ ہے دین کا اول۔ یہاں مجاہدہ ضروری ہے۔ مجاہدے کے بغیر تعمیلِ حکم کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ تو آپ سمجھ گئے نا کہ زحمت ومشقت دین کا content نہیں ہے بلکہ نفس کی ابتدائی حالت ہے جو تعمیلِ حکم میں یقیناً پیش آتی ہے۔ اگر میرا مزاج مجاہدے اور ایثار والا نہیں ہے تو میں حکم کا مخاطَب بننا ہی گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ مشقت انگیز کر لینے کے بعد پھر دین کے contents کھلتے ہیں، پھر کمالاتِ بندگی جو دین کے حقیقی contents ہیں، ان تک پہنچنے کا سیدھا راستا مل جاتا ہے۔ بندگی کے تمام کمالات کا خلاصہ یہ ہے کہ نیت خالص ہو جائے اور قلب مطمئن۔ میں جب دنیا کی کشش کو ٹھکرا کر حکم پر عمل کرتا ہوں، نفس کی مطلوبہ لذتوں کو ترک کر کے اللہ کی فرماں برداری جاری رکھتا ہوں تو اس کے صلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس دین میں پہلے سے رکھی ہوئی نعمتیں، راحتیں اور لذتیں مجھے اسی زندگی میں چکھا دیتا ہے اطمینانِ قلب، یقینِ کامل اور اخلاص کی صورت میں۔ اس کے بعد میں پکار اٹھتا ہوں کہ ارے! دین میں تو راحت ہی راحت ہے، طمانیت ہی طمانیت ہے۔ پھر مجھے اس الٰہی اصول کا تجربہ میسر آجاتا ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار بندے سے خوش ہوتا ہے اور اسے خوش رکھتا بھی ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس ایک فقرے میں گویا ہر مسلمان کو اس کا منصوبۂ عبدیت دے دیا ہے کہ تم بندگی کی پوری عمارت کو اس بنیاد پر اور اس یقین کی اساس پر قائم کرو کہ

دینِ اسلام سے وابستہ ہوجانے کا آغاز ممکن ہی نہیں ہے نفس سے لڑے بغیر، مجاہدہ کیے بغیر، دنیا کی محبت سے بچے بغیر، طبیعت کے نامناسب مرغوبات کو چھوڑے بغیر۔ اس کے لیے جتنی محنت، مشقت اور ناگواری برداشت کرنی پڑے، کرلو ورنہ تم ہدایت کی اس رسی کو تھامنے کے لائق نہیں بن پاؤ گے۔ تعلق باللہ کی کوئی بنیاد اس کی فرماں برداری سے الگ ہوکر نہیں ہے۔ اطاعت اللہ سے تعلق کی سب سے پہلی شرط ہے۔ بندگی میں آگے بڑھنے کا ہر راستہ اسی سے شروع ہوتا ہے اور اسی کے سائے میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یعنی میں اللہ کا فرماں بردار بندہ ہوں، اس کے حکم کی تعمیل بہتر سے بہتر انداز میں کرنے پر جس حد تک قادر ہوں، کرتا رہوں گا۔ جیسے ہی دل کی آمادگی نفس کی ناگواری پر غالب آجائے گی، ویسے ہی تعمیل کے لیے اٹھائی جانے والی مشقت، راحت میں بدل جائے گی۔ پھر اطمینانِ قلب، مستجاب الدعوات ہونے کی کیفیت، اللہ کے حضور میں ہونے کی حالت، ترکِ غفلت کا مرتبہ، ترکِ معصیت کی منزل۔۔۔ یہ سب چیزیں اس کے نتیجے میں حاصل ہوں گی۔ اور ان سب نعمتوں کے مجموعے کے لیے بہترین لفظ وہی ہے جو حضرت نے استعمال فرمایا: راحت! یہ راحت نصیب ہوجائے تو بندے کو یوں لگتا ہے جیسے پہلے کی مشقت تو بالکل تھوڑی سی تھی۔ اب آپ سمجھے کہ شاہ صاحب نے کچھ مشقت کیوں کہا ہے اور اس کے علاوہ راحت ہی راحت فرمایا ہے، بڑی راحت نہیں کہا۔ بڑی راحت میں تمام راحتیں شامل نہیں ہیں جبکہ راحت ہی راحت میں سب راحتیں داخل ہیں۔ یعنی دین وہ راحت ہے جس کے باہر کسی راحت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آپ کی قادر الکلامی تو ہے ہی، کامل الحالی بھی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ کچھ کا حرف استعمال کر کے شاہ صاحب نے یہ جتا دیا ہے کہ وہ مشقت کا لفظ مجبوراً لکھ رہے ہیں کیونکہ مخاطب ہم ایسے نالائق لوگ ہیں۔ اور اسی طرح راحت کہتے ہیں اللہ کی خوشنودی کے ادراک کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حال کو۔ اس سے بڑھ کر راحت کیا ہوگی کہ اللہ مجھے قبول فرمالے

اور اس قبولیت کی نشانی سے مجھے بھی مطلع کر دے۔ اب بات سے بات نکلتی جا رہی ہے لیکن خیر، کوئی حرج نہیں۔ راحت وہ حال ہے جو دل کو بھی اللہ سے جڑا رکھتا ہے اور باہر کے ماحول کو بھی۔ یعنی راحت باطنی کیفیت بھی ہے اور خارجی سچویشن بھی۔ دل بھی طمانیت کے ساتھ ہے اور ماحول بھی خیر پر مبنی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو شاہ صاحب کے ارشاد کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ مجاہدات کے نتیجے میں اللہ سے تعلق سچا اور پختہ ہو جائے تو اندر اور باہر دونوں کا نظام دینی بن جاتا ہے۔ کیونکہ راحت حق سے مکمل مغلوبی کے سوا اور کیا ہے۔ تو راحت کامل اسی وقت ہوگی جب حق کا غلبہ انفس پر بھی قائم ہو جائے گا اور آفاق پر بھی۔ تو بھائی، اس امت کا دین اس وقت تک ناقص ہے جب تک اسے خارجی دنیا پر بھی غلبہ حاصل نہیں ہو جاتا۔ مسلمان ہونے کا مکمل مطلب یہی ہے کہ انسان بھی خدا سے معمور رہے اور اس کی دنیا بھی۔ ایسا ہو جائے تو یہ راحت ہی راحت ہے، یعنی احوال بھی راحت کے ہیں اور ماحول بھی راحت کا ہے۔ راحت کے خارجی مظاہر نہ ہوں تو محض کسی باطنی کیفیت کو راحت کا عنوان نہیں دیا جاسکتا۔ راحت ایک حالت ہے جو داخل و خارج دونوں کو محیط ہے۔

تو جو شخص اللہ کی راہ میں محنت اور مشقت کو محبوب نہیں رکھتا، وہ اس راستے پر پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ افسوس، ہمیں اللہ کے لیے مجاہدہ محبوب اور مرغوب نہیں رہا اور ہمارے اندر یہ لگن ہی نہیں رہ گئی کہ حکمِ الٰہی کی تعمیل بہتر سے بہتر انداز میں کی جائے اور ہم اس فکر اور اس شوق ہی میں نہیں رہتے کہ اللہ کا ہر حکم کامل ترین صورت اور بہترین حالت میں یعنی اتباعِ سنت کے دائرے کے اندر رہ کر بجالایا جائے۔ کبھی دیکھو تو سہی کہ اس فقرے میں پوری سرگذشتِ نبوت بیان ہوگئی ہے۔ مکی دور مشقت والا تھا اور مدنی دور راحت والا۔ لیکن یہاں مشقت کو ان معنوں میں ہرگز نہ سمجھا جائے جن معنوں میں ہمارا نفس اسے محسوس کرتا ہے۔ یعنی ہمارے لیے مشقت نفس کی ناگواری کے ساتھ ہے

جو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس جماعت کی محنت اور جد و جہد کے احساس سے بالکل مختلف ہے، وہاں مشقت بھی طمانیت کے ساتھ تھی۔

تو ہمیں بھی مشقت پر مائل ہونا چاہیے تاکہ راحت کے حامل بن سکیں۔ اس اصول کو ہم دنیا کے حوالے سے پوری طرح مانتے ہیں لیکن دین میں ہم نے یہ ضد کر رکھی ہے کہ راحت کو مشقت کے بغیر ہونا چاہیے۔ ہمیں اس ضد کو چھوڑنا پڑے گا ورنہ یہ دین ہمیں چھوڑ دے گا۔ اگر اس انجام سے بچنا ہے تو پھر ہمیں دین کو اس کے اول سے اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ایک معمول بنائیں۔ روزانہ اپنا محاسبہ کیا کریں کہ آج ہم نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے یا اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے کیا کیا ہے۔ اس کے علاوہ مباحات کے دائرے کو پھیلانے کی بجائے اسے سکیڑنے کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ وہ بندہ اللہ کے ساتھ بے وفائی کا مزاج رکھتا ہے جو اباحت کے دائرے میں مسلسل توسیع کرتا رہتا ہے۔ اگر کوئی خیر خواہ ٹوکے کہ تم چھ گھنٹے سے کمپیوٹر پر گیمز کھیل رہے ہو، اب اٹھ جاؤ اور کوئی ڈھنگ کا کام کرو تو یہ اس سے اکڑ کر کہے گا کہ کیا کمپیوٹر گیم کھیلنی حرام ہے؟

مجھے تو یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں اباحت کے دائرے کو اتنا نہ پھیلا دیا جائے کہ دینی اعمال واشغال کا وقت ہی نہ رہ جائے اور دین سکڑ کر بس پانچ نمازوں تک محدود ہوجائے۔ اباحت پسندی (اباحیت پسندی نہیں) خود مذہبی لوگوں میں اتنا زور پکڑ چکا ہے کہ زندگی کے بیشتر حصے کو اللہ سے غیر متعلق کر لیا گیا ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی حلال وحرام کی کشاکش میں نہ گزرے اور ہمارے اکثر معاملات مباح کے دائرے میں آجائیں، یعنی اللہ کے حکم اور اس کی مرضی سے متعلق نہ رہیں۔ اب آپ خود سوچیں کہ اس سے بڑی بے وفائی کیا ہوسکتی ہے کہ بندہ زندگی کے بیشتر حصوں سے اللہ کو لاتعلق رکھنے پر نہ صرف یہ کہ راضی ہوجائے بلکہ اس لاتعلقی کو اور بڑھانے کی کوششیں کرتا رہے۔ یہ سنگین بے وفائی ہے۔ ایک بندہ چاہے عمل میں جتنا بھی

کمزور ہو لیکن اللہ کے لیے وفاداری کا جذبہ رکھتا ہے، تو وہ بھی ہرگز یہ نہ چاہے گا کہ اس کی زندگی کا معمولی سا حصہ بھی اللہ کے تعلق سے اور اس کی نسبت سے محروم رہ جائے۔ اب دیکھیے یہ بے چارہ احکام پہ عمل نہیں کر پا رہا، یا پورا عمل نہیں کر پا رہا لیکن اللہ کے ساتھ بے وفائی کا مرتکب نہیں ہے اس لیے اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود، سچے دل سے اللہ کے ساتھ متعلق رہنا چاہتا ہے۔ یہ آدمی اس عالم سے بہت بہتر ہے جو دین کو سکیڑنے کی عالم گیر مہم میں معاون کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس بندے کا، ان شاء اللہ، گناہ بھی بخشا جائے گا لیکن اندیشہ ہے کہ اس عالم کی نیکی اور عبادت بھی قبول نہ کی جائے گی جو دنیا اور زندگی سے اللہ کو بے دخل کرنے کی کوششوں میں شامل ہے۔

اللہ سے لاتعلقی کی وبائے عام سے بچنا ہے تو ہم سب کو چاہیے کہ تنہائی کا بیش تر وقت اللہ کے لیے خاص کریں اور گناہ سے بالکل سیدھے سادے معنوں میں بچنے کا اہتمام رکھیں۔ یعنی غلطی کی کوئی تاویل نہیں، کوئی بہانہ نہیں۔ خلوت ہو یا جلوت، دونوں میں ترکِ غفلت اور ترکِ معصیت کے آئڈیلز کو قلب وذہن میں حاضر رکھیں۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ محنت اور حاضر دماغی درکار رہے۔ موجودہ زمانہ ایسا ہے کہ ہمیں جلوت میں اتنی مصروفیات نہیں ہیں جتنی کہ تنہائی میں ہیں۔ لیکن یہ مصروفیتیں زیادہ تر اختیاری ہیں، جبری نہیں۔ تو اختیاری مصروفیتوں سے بھری ہوئی تنہائی میں بھی اگر ہم اللہ سے منہ پھیر کر بیٹھے رہیں تو یہ بڑی ناسمجھی ہے۔ آپ کو لیپ ٹاپ پر بیٹھنا ہے، ضرور بیٹھیں لیکن بس اتنا یاد رکھیں کہ آپ کا ہر کام، آپ کی ہر مصروفیت یا تو آپ کو اللہ سے قریب کرتی ہے یا دور دھکیلتی ہے۔ دنیا کا ہر کام یہ دو تاثیریں ضرور رکھتا ہے۔ اپنے ہر کام کو اس کسوٹی پر پرکھنے کی عادت ڈالیں۔ جدید زندگی میں اللہ سے دور لے جانے والی طاقت بڑھتی جا رہی ہے۔ ٹیکنالوجی میں ترقی کے تمام مظاہر میں اللہ سے دوری کا عنصر، قرب کے جوہر پر غالب آچکا ہے۔ تمام ماڈرن (gadgets) اگر بے دھیانی سے استعمال کیے جائیں تو یہ

اللہ سے فاصلہ پیدا کر دیتے ہیں اور مزید خطرناک بات یہ ہے کہ انہیں استعمال کرنے والا شخص اس فاصلے پر رفتہ رفتہ راضی بھی ہو جاتا ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ آدمی جیسے جیسے ٹیکنالوجی کی 'برکات' سے استفادہ بڑھاتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ سے دوری پر راضی ہوتا جاتا ہے۔ اس کے لیے رفتہ رفتہ اللہ کی غیر شعوری یاد بھی ناخوش گوار ہو جاتی ہے۔ پہلے جو مجاہدہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا تھا، آج وہ اللہ سے دور رہنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ سے دوری کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور لوگ جانتے ہیں کہ یہ وبا کس وجہ سے پھیلی ہے، اس کے باوجود آرام سے ہیں اور خوش ہیں۔ اس رویے کو کم از کم جو عنوان دیا جا سکتا ہے وہ 'بے وفائی' کا عنوان ہے۔ ہم لوگ اللہ سے مسلسل بے وفائی کو اپنا طرزِ حیات بنا چکے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ ہماری نماز بھی اس بے وفائی کا ایک استعارہ ہے کہ چلو یہ بوجھ بھی جلدی سے اتار آئیں۔ تو بھائی، دین کی قانونی خلاف ورزی کے مظاہر کی حیثیت اب ثانوی ہو گئی ہے۔ اب ہمیں اخلاقی اور وجودی انحراف کا سامنا ہے، اپنے اندر بھی اور باہر بھی۔ ایک نارمل ماحول میں گناہ کا سبب نفس کی کوئی کمزوری ہوا کرتی ہے لیکن آج گناہ کا سب سے بڑا محرک اللہ سے دانستہ بے وفائی ہے۔ بے نمازی کو نماز بعد میں پڑھوانا، پہلے نمازیوں کے اندر چھپی ہوئی بے وفائی کا علاج ڈھونڈو۔

تو خیر، میرے اور آپ کے لیے پہلا کام یہ ہے کہ ہم اپنی تنہائی اچھی بنائیں۔ تنہائی اللہ کو خوش کر دینے والی ہو جائے اور سماجی زندگی، کاروباری زندگی وغیرہ اللہ کے غضب سے بچانے والی بن جائے تو سمجھو کہ ہماری تخلیق کا مقصد پورا ہو گیا۔ تنہائی میں لمبے سجدوں کو معمول بناؤ اور ان سجدوں میں رونے کی کوشش کرو۔ گریہ اللہ کی حضوری کا سب سے سچا حال اور سب سے ٹھوس نتیجہ ہے۔ آنسو بڑی چیز ہے، یہ محنت کا پھل ہے اور راحت کا بیج ہے۔

جس طرح خلوت میں مجاہدہ کرنا ہے تاکہ ہماری انفرادیت کی مطلوبہ تشکیل ہوجائے، اسی طرح معاشرت میں بھی مجاہدہ کرنا ہے تاکہ ہماری اجتماعیت حق، خیر اور جمال کے اقدار پر استوار ہوجائے۔ عاجزی اور خیرخواہی مسلمان کے سماجی وجود کا مزاج ہے۔ آپ سمجھتے ہیں ناں کہ سماجی وجود انسانوں کے مزاج سے بنتا ہے، خالی خولی باتوں سے نہیں۔ تو مسلم مزاجِ معاشرت عاجزی اور خیرخواہی اور ایثار وانکسار سے بنتا ہے۔ اس مزاج کو اپنے اندر ہر صورت میں پیدا کرنا ہے اور رُو بہ کمال حالت میں برقرار رکھنا ہے۔ ان اوصاف کی اہمیت اس بات سے سمجھیں کہ ان کے بغیر آدمی میں اتباعِ سنت کا مادہ ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاجِ معاشرت یہ تھا کہ 'لوگو! آپس میں بھائی بھائی بن کے رہو اور ایک کے مقابلے میں دوسرا فخر نہ کرے'۔ تو جناب، سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ خلوت اللہ کے لیے، جلوت اَمرُ اللہ کے لیے۔ یہ وہ مقصود ہے جسے حاصل کرنا ضروری ہے اور جس میں کوئی عذر ڈھونڈنا اللہ سے بے وفائی ہے۔

یہ بہت شرمندگی کی بات ہے کہ آدمی اپنے وقت کا اور اپنے جذبات کا بہترین حصہ اللہ رب العزت کے لیے مخصوص نہ رکھے۔ یہ بہت شرمندگی کی بات ہے کہ اللہ کو یاد کرنے کا عمل فرصت اور فراغت پر موقوف رکھا جائے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ سب کاموں سے فارغ ہوکر تھکن سے چور حالت میں مارے باندھے نفل کے لیے مصلیٰ بچھایا جائے اور جلدی جلدی، بالکل بے شوقی بلکہ بیزاری کی حالت میں چار سجدے کر کے سلام پھیر دیا جائے۔ نفل بلکہ تمام اذکار کی روح ہے شوق اور طوالت۔ تنہائی میں پڑھے جانے والے نوافل کی تقریباً مستقل سنت ہے کہ شوق سے پڑھے جائیں اور لمبے کر کے پڑھے جائیں۔ یعنی اپنے وقت اور قلب کا بہترین حصہ اللہ کے لیے لگایا جائے اور اپنے ذہن کی بہترین قوتوں کو اللہ کی طرف یکسو رکھا جائے۔

ان باتوں پر عمل کا کوئی خاص نصاب نہیں ہے۔ ان ضروری چیزوں کو حاصل کرنے

کے لیے جو مسنون عمل اختیار کرلیا جائے وہ ان شاء اللہ نتیجہ خیز ہوگا۔ بس نیت اور کوشش یہ رہنی چاہیے کہ خلوت اللہ کے حضور میں گزرے اور جلوت اللہ کے شعور میں۔ یہی مقصدِ زندگی ہے، یہی مقصودِ بندگی ہے۔

سوال: اللہ سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا حکم ہے۔ اس کی حکمت اور اہمیت سمجھا دیں؟

جواب: اس سوال کا ایک ہی فقرے میں جواب دیا جاسکتا ہے۔ خشیت کے بغیر اللہ غیر حقیقی ہے اور محبت کے بغیر بندہ غیر حقیقی ہے۔
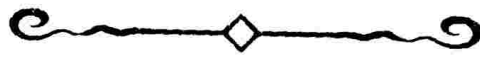
حیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

جب ہم تزکیے اور اصلاح کی بات کرتے ہیں تو اس کا پہلا اور سب سے بنیادی مطلب ہوتا ہے اخلاقی وجود کی اصلاح۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور مزاجِ بندگی سے مناسبت نہ ہو تو تزکیے کا سارا عمل اور اصلاح کے تمام تصورات بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ صرف اخلاقی وجود ہی نہیں بلکہ اللہ سے تعلق کے تمام راستوں میں ایسی رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں جنہیں کسی اور ذریعے سے پار نہیں کیا جاسکتا۔ مانے ہوئے عقائد ذہن میں مرجھا جاتے ہیں اور حکم اور ارادے کے تعلق میں ایک رسمیت، تصنع، احساسِ جبر اور میکانکی پن کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ اس خلا میں اللہ سے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق کا کوئی حق پورا نہیں ہوسکتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع کا ناگزیر اور مجموعی مطلب ہی یہ ہے کہ ہم اپنی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل کا عمل آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے زندہ اور بامعنی مناسبت پیدا کر کے کریں۔ اس لیے تزکیے کی تمام تر حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مزاجِ بندگی، ذوقِ عبودیت اور مبارک طبیعت کی تاثیر کو نفس میں مسلسل رکھا جائے اور شخصیت کی تکمیل کے تمام عناصر کو وہیں سے متعلق رکھا

جائے۔ تو بہر حال دین پر عمل کرنے کی تمام صورتوں اور دین کو ماننے کی ضروری حالتوں کا حصول اخلاقی وجود کی بیداری سے مشروط ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب ہے نفس میں اللہ کی محبت اور خشیت پیدا کرنا، اسے اللہ کی طرف رغبت اور اس کی اطاعت کا جذبہ فراہم کرنا۔ دوسرے لفظوں میں نفس کو آدابِ بندگی سکھانا اور اس میں مزاجِ عبودیت پیدا کرنا تاکہ اطاعت میں ناگواری نہ رہ جائے اور اس کے ساتھ ساتھ نفس میں کوئی عُجب اور خود پسندی بھی نہ پیدا ہو۔

اپنے تزکیے کے لیے مجاہدہ کرنے والے کو دو ذمے داریاں اٹھانی ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نفس کے مادۂ خیر کو کمزور نہ پڑنے دے اور دوسری یہ کہ داعیاتِ شر کو طاقت نہ پکڑنے دے۔ ان ذمے داریوں کو اخلاص اور سچائی کے ساتھ ادا کرتے رہنے سے جب اللہ کی توفیق سے کوئی فضیلت میسر آجائے تو اس خیر و فضیلت پر میرے اندر خود پسندی کا کوئی عنصر داخل نہ ہو سکے۔ کیونکہ اخلاقی فضائل اور کمالاتِ بندگی کا حصول اگر عاجزی اور انکسار کا سبب نہیں بنتا تو اس کا بندگی اور اخلاقِ حسنہ سے تعلق نہیں ہے۔ نفسِ امارہ کی سب سے گہری چال غالباً یہی ہوتی ہے کہ وہ خیر کی ایسی صورت بناتا ہے جس کا معنٰی شر ہوتا ہے۔ یعنی صورتِ خیر اور معنیِ شر کو اس طرح اکٹھا کر دیتا ہے کہ اچھے بھلے آدمی کو اس کاروائی کی خبر نہیں ہو پاتی۔ تو یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جو نیکی اور جو فضیلت خود پسندی کا موجب بنے وہ عمومی گناہ اور نقص سے بدتر ہے۔ اللہ ہم کو تمام پوشیدہ اور علانیہ آفتوں سے محفوظ رکھے اور ہماری کمزوریوں کے باوجود ہماری نیت کو خالص رکھے اور ہمیں اتنے حسنات اور فضائل ضرور نصیب فرما دے جو آخرت میں سزا سے بچنے کا وسیلہ ثابت ہوں اور اس کی خوشنودی تک پہنچا دیں۔ آمین۔

اگر پوچھا جائے کہ نفس کا تزکیہ کرتے ہوئے پہلے کس وصف کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ تو میرا جواب یہ ہوگا کہ حیا! نفس میں حیا کا مادہ بیدار ہو جائے تو دیگر

اخلاقی فضائل کا حاصل ہونا آسان ہوجاتا ہے۔حیا امُّ الاخلاق ہے، یہ اخلاقی وجود کی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔نفس میں اگر حیا کا مادہ مفقود یا کمزور ہوتو بندہ مجاہدے کر کے بھی اخلاق کی کچھ بے روح صورتیں ہی حاصل کر سکے گا۔حیا تمام اخلاق کی روح ہے، اگر نفس میں یہ جوہر خوابیدہ حالت میں ہےتو سب سے پہلے اسے بیدار کیا جائے اللہ کی آواز سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ندا سے، پوری حاضر دماغی کے ساتھ اور پوری آمادگی کے ساتھ۔

أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ، وَهُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الحَيَاءِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((دَعْهُ فَإِنَّ الحَيَاءَ مِنَ الإِيمَانِ)) متفق عليه

’’سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایک انصاری صحابی کے پاس سے ہوا جو اپنے بھائی کو سمجھا رہے تھے (موقع یہ تھا کہ ان صاحب میں شرمیلا پن بہت تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی بات نہیں کر پاتے تھے، اپنا حق نہیں مانگ پاتے تھے، شرمیلا پن ان کے لیے رکاوٹ بن رہا تھا۔اس پر یہ انصاری صحابی انہیں سمجھا رہے تھے کہ اتنا شرمیلا پن بھی ٹھیک نہیں ہوتا)۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بات سن لی یا بات کا کوئی حصہ سنا تو فرمایا: ’’بس رہنے دو (یعنی بات کو اس رخ پر نہ لے جاؤ)! حیا وشرم تو ایمان کا ایک شعبہ ہے‘‘ (متفق علیہ)

غور کیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نفسیاتی عارضے کے علاج کے طور پر بھی وہ گفتگو قبول نہیں فرمائی جو اس علاج میں معاون تو تھی لیکن یہ امکان بھی رکھتی تھی کہ اسے قبول

...سے دوری جس

...کرنے کے نتیجے میں حیا کا مادہ کمزور پڑ سکتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحیح مشورے کو بھی امکانی ضرر کی وجہ سے رد فرما دیا۔ یہ بات وہ بے چارے کیا سمجھیں گے جو اپنے ذرا ذرا سے مفادات کے لیے، چھوٹی چھوٹی سی ضرورتوں کے لیے رخصتیں ڈھونڈنے کے عادی ہیں۔ اگر ہم صرف اس روایت پر سنجیدگی سے غور کر لیں تو ہم پر واضح ہو جائے گا کہ عارضی فائدے کے لیے دائمی نقصان کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ ایک بات قانوناً صحیح ہو لیکن اخلاقاً مضر ہو تو قانونی جواز کو اخلاقی نقصان کے احتمال پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ ہماری موجودہ مذہبی نفسیات کے اکثر مظاہر اسی غلطی کا نتیجہ ہیں کہ قانون کی مراد کو نفس پر حاکم بنائے بغیر اور قانون و اخلاق کی مجموعی وحدت کو اہمیت دیے بغیر ایسے اعمال اور رویے اختیار کر لیے گئے ہیں جو بظاہر ایک سطحی اور مشینی قسم کا قانونی جواز تو رکھتے ہیں مگر اخلاقی ہلاکت کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ شریعت پر عمل اگر مفیدِ تزکیہ نہیں ہے تو وہ در اصل شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم نہیں ہے۔ اب چاہے الفاظ وہی ہوں لیکن یہ الفاظ اپنے حقیقی اور لازمی معانی سے منقطع ہو کر کام میں لائے جا رہے ہیں۔

اس حدیث کا ایک ٹکڑا صحیح مسلم میں زائد ہے۔ وہ ٹکڑا یہ ہے کہ ((الحیاءکلہ خیر))'حیا ساری کی ساری خیر ہے''۔ ساری کی ساری خیر ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ کل اخلاق کی پیدائش حیا سے ہوتی ہے اور ہر اخلاقی وصف کو حیا کی تصدیق اور شہادت حاصل ہونی چاہیے۔ جس میں حیا نہیں ہے، اس کا کوئی اخلاقی وصف اور روحانی حال قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ حیا کے بغیر اخلاقی مستقبل سے مایوس ہو جانا چاہیے اور حیا کے ساتھ موجودہ اخلاقی پستی میں بھی پر امید رہنا چاہیے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
((الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ - أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ - شُعْبَةً،

فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ)) متفق علیه

جنابِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان کی کچھ اوپر ستر یا کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں (تعداد میں راوی کو شک ہے)۔ان شاخوں میں بلند درجہ اور افضل شاخ لا الہ الا اللہ کی ہے۔ اور سب سے کم درجے کی بات، تکلیف دینے والی چیز راستے سے ہٹا دینا ہے۔اور حیا ایمان کا شعبہ ہے''۔

اس حدیثِ مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایمان کی سب سے بلند شاخ بھی ارشاد فرمادی اور سب سے نچلا درجہ بھی بیان فرما دیا۔ اس کے بعد حیا کو الگ سے بتایا کہ یہ ایمان کا شعبہ ہے۔ حیا کو یہ امتیازی حیثیت دینے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ حیا کا وصف پیدا ہو جائے تو تم ایمان کی سب سے اونچی شاخ پر بھی اللہ کی حمد کرنے والے پرندے کی طرح بیٹھ سکتے ہو اور سب سے نچلے عمل کو معمول بنا لینے والے بھی بن سکتے ہو۔یعنی حیا کی بدولت اللہ سے تعلق کے حقوق بھی اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں اور مخلوقات کے ساتھ تعلق کے نظام کی پاس داری بھی عمدہ طریقے سے ہو سکتی ہے۔ اخلاق اسی کو تو کہتے ہیں کہ تعلق باللہ کے آداب بھی اچھی طرح ادا کیے جائیں اور مخلوق کے حقوق کو بھی عمدگی سے پورا کیا جائے۔اللہ کے ساتھ تعلق کی اساس توحید پر ہے اور مخلوق کے ساتھ تعلق کی بنیاد ان کی عملی خیر خواہی پر۔ایمان ایک دائرہ ہے جس کی دو قوسیں ہیں: تعلق بالحق اور تعلق بالخلق۔ حیا سے ان دونوں میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آج موقع نہ ملا تو ان شاء اللہ کسی اگلی نشست میں حیا کے موضوع پر اس پہلو سے کلام کریں گے کہ اپنی اخلاقی ساخت میں تعلق کا یہ دو طرفہ نظام جن بنیادوں پر چلتا ہے، حیا ان میں سے ایک لازمی بنیاد ہے۔

عَنْ أَبِي سَعِيدِ الخُدْرِيِّ، قَالَ: ((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ العَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا، فَإِذَا رَأَى شَيْئًا يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فِي وَجْهِهِ)) متفق عليه

''جنابِ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی زاویہ نشیں پردہ دار دوشیزہ سے بھی زیادہ باحیا تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی بات ناپسند اور ناگوار ہوتی ہم اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ اقدس کے تاثرات سے پہچان جاتے تھے''۔ (متفق علیہ)

اس روایت کو ایک اور روایت سے ملا کر دیکھا جائے تو عظیم الشان اخلاقی حقائق اور معارف حاصل ہو سکتے ہیں۔

مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْتَصِرًا مِنْ مُظْلِمَةٍ ظُلِمَهَا قَطُّ مَا لَمْ يُنْتَهَكْ مِنْ مَحَارِمِ اللهِ شَيْءٌ فَإِذَا انْتُهِكَ مِنْ مُحَارِمِ اللهِ شَيْءٌ كَانَ اَشَدِّهِمْ فِي ذٰلِكَ غَضَبًا

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی ظلم کا بدلہ لیا ہو مگر یہ کہ اللہ کی کسی کی حرمت کو پامال کیا جائے۔ اور اگر اللہ کی کسی حرمت کو پامال کیا جاتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غصہ میں سب سے شدید ہوتے تھے۔

یعنی حیا صرف شرم کو نہیں کہتے، یہ غیرت بھی ہے، حمیت بھی ہے۔ اصل حیا، اللہ سے حیا ہے۔ ہمارے آپس کے تعلق میں حیاداری کے تمام مظاہر اسی حیا سے برآمد ہونے چاہییں جو ایک سچا بندہ اللہ کے ساتھ تعلق میں رکھتا ہے۔ حیا کا اصل مقصود ہے اللہ کے آگے شرمندگی سے بچنا۔ یہ نہیں ہے تو پھر حیا بے اصل اور بے حقیقت ہے۔ ان شاء اللہ

اس گفتگو کے آخر میں حیا کے اہم نکات بیان کریں گے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حیا کے بنیادی معانی کیا ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل علم نے حیا کی حقیقت کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ ایک ایسی خصلت ہے جو ناگوار اور بری باتوں کو چھوڑنے پر ابھارتی ہے اور حق دار کا حق ادا کرنے میں کوتاہی سے روکتی ہے۔ سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حیا یہ ہے کہ آدمی اولاً اللہ تعالیٰ کے انعامات، مہربانیوں اور نعمتوں پر غور کرے اور پھر اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا جائزہ لے۔ اس کے نتیجے میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسی کا نام حیا ہے۔ حضرت جنید صوفیوں کے امام ہیں۔ ان حضرات کے پیشِ نظر یہ ہوا کرتا تھا کہ طبیعت میں خیر غالب آجائے کیونکہ نفس زیادہ تر طبیعت ہی ہے اور اخلاقی وجود کا تزکیہ طبیعت اور مزاج کے تزکیے کے بغیر محال ہے۔ اخلاقی وجود اگر ایک درخت کی طرح ہے تو یوں سمجھیں کہ اس کی جڑ حیا ہے۔ طبیعت میں حیاداری ہو تو اخلاق کی تمام شاخیں سرسبز وسیراب رہتی ہیں۔ حیا کے بغیر کچھ اخلاقی رویے اور اعمال اختیار تو کیے جاسکتے ہیں مگر وہ مصنوعی، بے روح اور محض دکھاوا ہوں گے۔ سیدنا جنید کی بات کو سمجھیں۔ وہ امامِ تزکیہ ہیں، ان کی اس حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی بات کو آمادگی کے ساتھ سنیں۔ یہ بہت قیمتی تدبیر ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ اللہ کی ہم پر کیا کیا عنایتیں، نوازشیں، مہربانیاں اور رحمتیں ہیں۔ ہم ان غیر متناہی رحمتوں میں سے کسی ایک کے بھی حق دار نہیں ہیں۔ اب یہ دیکھیں کہ رحمتِ الٰہیہ کی اس فراوانی اور بے پایانی میں ہم اللہ کے حقوق پورے کرنے میں کتنی کوتاہی کر رہے ہیں۔ تو جو شخص بھی اللہ کی رحمت اور اپنی غفلت کو اکٹھا کر کے دیکھے گا وہ اپنے اندر پستی، نافرمانی، ناشکری اور غفلت کے سوا کچھ نہیں پائے گا۔ وہ دیکھ لے گا کہ نفس غفلت کی کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے اور غفلت کے زہریلے دھوئیں میں سانس لے رہا ہے۔ تو اس تضاد کے واضح ہو جانے پر کہ اللہ کیا کر رہا ہے اور

میں کیا کر رہا ہوں، نفس میں شرمندگی اور اپنی اصلاح کے عزم کی جو کیفیت پیدا ہوگی، وہی حیا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ وہ شرمندگی حیا کا حال ہے اور عزمِ اصلاح حیا کا تقاضا۔ ظاہر ہے شرمندگی اگر سچی ہوگی تو اس کے نتیجے میں کم از کم شرمندگی کے سبب کو دور کرنے کی قوت ضرور بیدار ہوگی۔

بڑے لوگوں کی بات بھی بہت جامع اور مکمل ہوتی ہے۔ ہمارے سلف چاہے کسی بھی ڈسپلن سے ہوں، کسی بھی روایت سے ہوں، چاہے محدث ہوں یا فقیہ ہوں یا صوفی ہوں، ان کا کلام جامعیت کے ساتھ ہوتا تھا۔ انہیں یہ وصف اپنے اخلاص کی وجہ سے حاصل تھا۔ اخلاص نہ ہوتو ایمانی شعور پیدا ہی نہیں ہوتا، جیسے حیا نہ ہوتو اخلاقی وجود کی نشو ونما نہیں ہوسکتی۔ تو خیر، یہ بات صرف سلف میں تھی کہ ان کے ایک فقرے میں دین کی بہت ساری ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان ہوتا تھا۔ اللہ ہمیں اس روایت کے تسلسل کا ذریعہ بنائے۔

تو یہ بات واضح ہے نا کہ گناہ کو خلافِ غیرت سمجھنا، حیا کا ایک بڑا تقاضا ہے۔ غیرت ایک ایسا جذبہ ہے جو تمام احساسات میں سرایت کر جاتا ہے اور شخصیت کی تشکیل کے سارے عناصر کو خود سے متعلق رکھتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اللہ کو مانوں اور اس کی ناراضی سے نہ ڈروں اور اس کی خوشنودی کا طالب نہ رہوں۔ یہ ڈر اور یہ طلب، غیرت کا قوام ہے۔ تعلق کی سچائی کو چیلنج پیش آ جائے تو اس سچویشن میں نفس میں جو ردِّ عمل پیدا ہوتا ہے، غیرت اسی کا نام ہے۔ ہمارے یہاں کچھ طبقوں میں، کچھ برادریوں میں ایک قبائلی غیرت تو پائی جاتی ہے جو انہیں جان دینے اور جان لینے پر آمادہ رکھتی ہے۔ ان لوگوں کو اپنی غیرت مندی پر فخر بھی بہت ہے لیکن ان کی اکثریت یہ نہیں جانتی کہ یہ غیرتِ نفسانی ہے، غیرتِ ایمانی نہیں، بلکہ یوں کہنے میں بھی حرج نہیں ہے کہ قبائلی غیرت کا اکثر حصہ حیوانی ہے، انسانی نہیں۔ ان غیرت داروں کی حمیت گناہ پر بیدار کیوں نہیں ہوتی۔

گناہ سے بڑھ کر خلافِ غیرت عمل اور کیا ہوسکتا ہے۔ حیا سے منقطع ہو کر کوئی غیرت نہیں، یا دوسرے لفظوں میں جو اللہ سے نہیں ڈرتا اس کی غیرت محض تکبر ہے، جو اللہ پر نہیں مرتا، اس کی غیرت فقط سنگ دلی ہے۔ حیادار اور غیرت مند آدمی کی ایک پہچان تو یہ ہے کہ وہ نرم دل ہوتا ہے اور دوسری زیادہ بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کے لیے یہ تصور ہی انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہے کہ اللہ اس سے ناخوش ہے۔ یعنی اللہ کی ناخوشی کا تصور جہنم کی آگ کے تصور سے بھی زیادہ ہیبت ناک اور ہول ناک ہو جائے تو سمجھو کہ تم میں ایمانی حیا داخل ہوگئی ہے۔

جس کی تنہائی اچھی ہے وہ حیادار ہے اور جس کی تنہائی اچھی نہیں ہے اس کی حیاداری محض اداکاری ہے۔ حیا کی کسوٹی تنہائی میں گڑی ہوئی ہے اور ہر آدمی خود کو اس کسوٹی پر پرکھ سکتا ہے۔ حیا کے پودے کو اللہ نے دل اور فطرت کی زمین پر اگا رکھا ہے۔ یہ مسلّماتِ فطرت میں سے ہے، کوئی آدمی فطری مسلّمات میں خود کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ہر شخص کو یہ بات یقین سے معلوم ہے کہ اس میں حیا کس درجے کی ہے، اور ہے بھی یا نہیں؟ تو ہم اس بات کے پابند ہیں کہ قلب اور فطرت کی زمین پر لگے ہوئے اس پودے کی حفاظت کریں اور اسے مسلسل سیراب کرتے رہیں اللہ کی محبت کے چشمے سے، خشیت کے پانی سے اور معرفت کی روشنی سے۔ اس کی حفاظت جلوت میں ہوتی ہے اور سیرابی خلوت میں۔ تو حیا اسی وقت حقیقی ہوگی جب گناہ کا خیال بھی ہمارے لیے ڈراؤنا اور مکروہ بن جائے گا اور نیکی کا تصور بھی ہمارے اندر ایک موجبِ عمل رغبت پیدا کرے گا۔

استغفار سے بھی حیا کا مادہ بڑھتا ہے بلکہ طبیعت میں حیا نہ ہو تو استغفار اچھی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ تدبیریں ہیں: مثلاً نظر کی حفاظت۔ آنکھ اور حیا کا غالباً سب سے زیادہ ڈائریکٹ تعلق ہے۔ اس لیے نگاہ کی حفاظت حیا کی پیدائش اور پرورش کے لیے ایک لازمی عمل اور رویہ ہے۔ آنکھیں حیا کا بندھن توڑ دیں اور ماحول بھی

ایسا ہو جائے جس میں آنکھوں کی تربیت اور حفاظت کا کوئی سامان نہ ہو تو پھر دینی اور اخلاقی زندگی اپنے ہر پہلو سے محال ہو جاتی ہے۔ بے حیائی جرثومۂ مرگ ہے۔ دینی تہذیب، اخلاقی معاشرت اور ایمانی نفسیات کو درپیش سب سے بڑا خطرہ مسلم معاشروں میں پھیلتی ہوئی بے حیائی ہے۔ اور اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ بے حیائی اور اس کے مظاہر مذہبی لوگوں کو بھی فکر مند نہیں کرتے۔ اب یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا کہ تم عورت سے ہاتھ کیوں ملا رہے ہو اور ٹی وی کی اناؤنسر بے پردہ کیوں ہے۔ باطن کی صفائی اور معاشرے کی اخلاقی روح کا تحفظ کرنے والے مسائل یوں لگتا ہے کہ اب مذہبی مکالمے ہی سے نکل گئے ہیں۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ حبِ دنیا، حیا اور جہاد پر گفتگو کتنی کم ہو گئی ہے جیسے یہ دینی مسائل ہی نہیں رہے۔ جس رفتار سے بے حیائی اور گھٹیا پن پھیل رہا ہے، اسے روکنے کی مؤثر اور مربوط کوشش نہ کی گئی تو دینی معاشرت اور ایمانی نفسیات کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ بے حیائی ذہن کو بھی چھوٹا کر دیتی ہے، خصوصاً اس ذہن کو جو حیا کا تصور تو رکھتا ہے مگر اسے قابلِ عمل نہیں بننے دیتا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ کم از کم مسلم ذہن بے حیائی کی اس فضا میں اگر حالتِ تصادم میں نہیں رہتا تو پھر اسے سکڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ آنکھوں سے ذہن اور دل کا نظام چلتا ہے۔ ان کا ذوقِ دید دل کے احوال پر بھی اثرانداز ہوتا ہے اور ذہن کے مزاج کو بھی بدل دیتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک دیکھ رہا ہے کہ بڑا حال اور بڑا خیال ہمارے دل اور ذہن سے کوچ کر چکا ہے۔ ہمارے محبوب بھی معمولی سے ہیں اور ذہن کو کشش کرنے والے مقاصد بھی بالکل گھٹیا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس dehumanization میں بے حیائی کا بھی بڑا کردار ہے، اس بے حیائی کا جو آنکھوں کے راستے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ یہ جو ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کہ کلاس روم میں، مجلس میں، مجمع میں حتیٰ کہ مسجد میں بھی اگر کوئی سنجیدہ اور گہری بات چھیڑ دی جائے تو آدھے لوگ تو سونے لگتے ہیں اور آدھے یہ شکایت کرتے ہیں کہ بڑی مشکل

باتیں تھیں، سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ ظاہر ہے جو دل ایک بے پردہ چہرے کو دیکھ کر سرشار ہو جاتا ہے وہ بھلا حقائق و معانی سے حاصل ہو سکنے والی سرمستی کو کیسے جذب کر سکتا ہے! بہت سے لوگ ہیں جو مجھ سے وقتاً فوقتاً گلہ کرتے ہیں کہ تمہاری باتیں مشکل ہوتی ہیں۔ انہیں تو میں کوئی جواب نہیں دیتا، زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہہ دیتا ہوں کہ بہتر ہے، انہیں آسان بنانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن آج مجبوراً کہہ رہا ہوں کہ ان شکایت کرنے والوں سے یہ پوچھنا چاہیے کہ جو بات تمہیں مشکل لگتی ہے، اسے سمجھنے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ مشکل کو حل کرنے کے کچھ معروف ذرائع ہیں جو سب کی دسترس میں ہیں، وہ تم نے کبھی استعمال کیے؟ یعنی کوئی لغت دیکھی ہو، کسی سے پوچھ لیا ہو یا تھوڑی دیر خود ہی غور کر لیا ہو۔ اگر ایسا کچھ بھی نہیں کیا تو تمہیں کسی بات کو مشکل کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میرے خیال میں تو یہ سب ذہنی پستی اور غیر سنجیدگی بے حیائی کے ماحول میں کسی مزاحمت کے بغیر رہنے کی نحوست ہے۔ حیا غیاب کو شہود پر غالب رکھتی ہے، اس لیے حیادار آدمی کے ذہن میں اور دل میں تہہ داری ہوتی ہے۔ اس کے احساسات اور تخیلات میں ایک غیر متناہی تنوع اور گہرائی ہوتی ہے۔ بے حیا آدمی کے پلّے میں کیا ہے۔ بس ایک چیز کو دیکھ لیا اور تسکین کے بھی سارے مطالبے پورے کر لیے اور شوق کے تمام تقاضے بھی تمام کر دیے۔ یہ بے چارہ تو حسن اور خیر اور حق سے کٹی ہوئی صورتوں ہی سے بھرا ہوا ہے اور ان ہی سے خالی ہے۔ اس کی سیرابی بھی بے نسب صورتوں پر موقوف ہے اور پیاس بھی ان ہی تک محدود ہے۔ ع

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا

حیا کے اہم نکات

اب مناسب ہوگا کہ ہم حیا کے کچھ اہم نکات بیان کر دیں جن کا ذکر گفتگو کے آغاز

میں آیا تھا:

۱۔ نگاہ کی حفاظت۔ نگاہ صرف آنکھ کی نہیں ہوتی، ذہن کی بھی ہوتی ہے۔ان دونوں کی حفاظت کرنی ہے۔ بے پردہ عورت کو اور بے شرمی کے مناظر کو نہ آنکھ سے دیکھنا ہے نہ ذہن کی نگاہ سے۔ یعنی بے حیائی کے مشاہدے سے بھی بچنا ہے اور تصور سے بھی۔

۲۔ فحش گفتگو کرنے اور سننے سے مکمل پرہیز۔ زبان بھی صرف منہ میں نہیں ہے، دل اور دماغ بھی بے زبان نہیں ہیں۔ ان تینوں زبانوں کو فحش گوئی سے بچانا ہے۔

۳۔ اپنی ذاتی تکلیف اور نقصان پر دوسروں کو فوراً معاف کر دینا۔

یہ تین چیزیں اگر معمول بن جائیں تو اللہ کے فضل سے قوی امید ہے کہ طبیعت حیا دار ہو جائے گی۔ یہاں ہم حیا اس کے معروف معنی میں کہہ رہے ہیں، یعنی شرم۔ اس میں غیرت وحمیت کے جو عناصر پائے جاتے ہیں، ان کی تفصیل ہو چکی ہے۔ اب یہاں ایک ایسی تدبیر عرض کرتا ہوں جو حیا بمعنی شرم اور حیا بمعنی حمیت دونوں کو دل میں پیدا کر دے گی۔ ان شاء اللہ۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ قرآن شریف کو محبت سے دیکھا کرو، اسے سینے سے لگایا کرو، اسے آنکھوں سے چوما کرو۔ ان شاء اللہ کچھ دنوں ہی میں دیکھ لو گے کہ نفس میں پاکیزگی کی ایک رَو دوڑ رہی ہے جس سے دل آنکھ اور ذہن سب دھلتے جا رہے ہیں۔ اس تدبیر کو اپنا معمول ضرور بنانا، مرتے دم تک کا معمول!

ایک مختصر سی بات اور کہنی ہے۔ مجھ ایسوں کی شامتِ اعمال ہے کہ آج کل دعوت و تبلیغ جیسے کلوننگ کا عمل بن گیا ہے۔ ایک داعی ہے، اس کا ایک مخصوص حلیہ ہے، ایک خاص اندازِ گفتگو ہے اور ایک جماعت ہے۔ یہ پورا پیکج سننے والے میں منتقل ہو جائے تو دعوت کو کامیاب سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس روش نے دعوتِ دین کو بھی خالص نہیں رہنے دیا۔

ارے بھائی، دعوت نام ہے تزکیے کے لیے آمادہ کرنے کا، مجاہدے کی رغبت پیدا کرنے کا، قرآن وسنت پر مبنی اجتماعیت کی تشکیل کا نہ کہ اپنا ہم خیال، ہم ذوق، ہم مشرب اور ہم جماعت بنانے کا۔ اب اچھا بھلا داعی بھی اتنا کافی سمجھتا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی جماعت میں کھینچ لایا، اس سے متاثر ہو کر لوگوں نے اس کا حلیہ اختیار کر لیا اور اب بہت سے لوگ اس کے اندازِ گفتگو اور نشست و برخاست کی نقل کرتے ہیں۔ تزکیہ وغیرہ ایک طرف رہ گیا بس فلاں کی جماعت اور فلاں کا حلیہ رواج پکڑ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب دین کی انفرادی تاثیر کمیاب ہے اور اجتماعی تاثیر نایاب۔ ہمارے لیے کسی جماعت کا فرد ہونا، امت کے رکن ہونے سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ ہم یہ جماعت اور وہ جماعت میں بٹ کر رہ گئے ہیں اور امت کی organic وحدت کے احساس سے عاری ہو چکے ہیں۔ دعوت کی اس خرابی کا اثر علمِ دین کی روایت پر بھی پڑ رہا ہے۔ لوگ نفسِ دین سے زیادہ تعبیرِ دین کے سلسلے میں حساس ہو گئے ہیں۔ علما بھی ہم خیالی کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ سادہ سے معاشرتی تعلق میں بھی ہم خیالی ایک بنیادی شرط بن چکی ہے۔ اس صورتِ حال میں وہ اختلافات بھی ناقابلِ برداشت ہو گئے ہیں جو دین میں کوئی علمی اور عملی خرابی نہیں پیدا کرتے۔ وحدت کا وہ جذبہ مذہبی زندگی اور دین دار لوگوں کی معاشرت سے خارج ہو چکا ہے جو حنفی کو حنبلی سے اور مقلّد اور غیرِ مقلّد سے پورے ذوقِ تعلق کے ساتھ اور احساساتِ مؤاخات کے ساتھ جوڑے رکھتا تھا۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ مختلف الخیال حضرات کو سراہنا تو دور کی بات ہے اب علما، مشائخ، مبلغین اور واعظین کے طبقات میں ہم خیال معاصرین کی تعریف بھی اول تو کی نہیں جاتی اور اگر مارے باندھے کرنی بھی پڑے تو بخل کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ایک موسیقار اپنے ہم عصر کسی دوسرے موسیقار کی، ایک شاعر دوسرے شاعر کی اور ایک کاتب دوسرے کاتب کی دل کھول کر مداحی کر سکتا ہے لیکن نہیں کر سکتا تو ایک پیر اپنے ہم عصر مشائخ کی

اور ایک مذہبی مقتدا دوسرے مقتدا کی۔ یہی مزاج ان کے مریدوں اور شاگردوں کا بھی ہے کہ اس زمانے میں میرے پیر سے بڑا پیر کوئی نہیں، میرے استاد سے بڑا استاد کوئی نہیں اور میری جماعت سے اچھی جماعت کوئی نہیں۔ استغفر اللہ۔ بھائی، ہم فہم میں مختلف ہوسکتے ہیں، خیال میں مختلف ہوسکتے ہیں، ذوق میں مختلف ہوسکتے ہیں، مسلک و مشرب میں مختلف ہوسکتے ہیں حتی کہ تعبیرِ دین میں مختلف ہوسکتے ہیں لیکن اللہ کے فضل سے نفسِ دین اور مقصودِ دین میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ہمیں دین کا کام ہم خیالی اور ہم رائی کے لیے نہیں کرنا کیونکہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کی حالت میں بھی ایک دوسرے کے پختہ مسلمان ہونے پر شاہد رہے ہیں۔ تو ہمیں بھی اپنے سلف ہی کی طرح رہنا چاہیے کہ شافعی اپنی فقہ چھوڑے بغیر حنفی کا مرید ہوسکتا ہے اور غیرِ مقلد اپنے موقف پر ثابت قدم رہتے ہوئے کسی مقلد کا شاگرد ہوسکتا ہے۔ اختلاف حق و باطل تک نہ پہنچا ہوا ہو تو دین کے فہم اور دین پر عمل کو بڑے پیمانے پر آسان بنا دیتا ہے۔ تو بہرحال، فروعی معاملات میں ہم خیال بنانا کوئی موضوع نہیں ہے، اصل موضوع ہے ہم مقصدی جو الحمد للہ ہمارے درمیان موجود ہے۔ بس اسی کو کام میں لانا ہے۔

اپنی اصلاح اور بچوں کی تربیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ، وَالصَّلاۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

جدیدیت نے اپنے مختلف اداروں کے ذریعے سے، یوں لگتا ہے کہ، ایک عالم گیر سطح پر کچھ بہت بنیادی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ دنیا میں بھی اور انسان میں بھی۔ یعنی دنیا کے بارے میں بھی بنیادی تصورات بدل چکے ہیں اور تصورِ انسان میں بھی ایسی جوہری تبدیلیاں داخل ہو گئی ہیں جن کے اثر سے شعور اور اخلاق کی بناوٹ ہی وہ نہ رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ انسان اور تہذیب کو چلانے والے اصول بدل جائیں تو اس تبدیلی کا اثر اُس ذہن اور مزاج پر بھی پڑتا ہے جو اس تبدیلی کا ویسے مخالف ہے۔ بالفاظِ دیگر لادینیت اگر انسانی نفسیات اور تہذیب کے مرکز میں اپنی جگہ بنا لے اور اندر باہر کی دنیا کا نظام چلانے والی قوت کی حیثیت اختیار کر لے تو اُس کی بنائی ہوئی فضا میں سانس لینے کا اثر اُن لوگوں پر بھی مرتب ہوتا ہے جو اُس فضا میں رہنا نہیں چاہتے اور اُس کے مخالف ہیں۔ مذہبی ذہن کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا ہے کہ یہ اپنے بس بھر جدیدیت سے دوری یا لڑائی کی حالت میں رہتا ہے لیکن اُس کی بنائی ہوئی دنیا میں رہنے پر مجبور ہے۔ اسے بدلنے کی نیت تو رکھتا ہے، کوشش بھی کرتا ہے لیکن اِس کوشش کو جن صلاحیتوں اور وسائل

کی ضرورت ہے وہ جدیدیت سے ٹکراؤ رکھنے والی مذہبی طاقتوں میں سردست مفقود ہیں۔ جدیدیت اپنے مخالفوں پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے، اس اثر اندازی کے بہت سے مظاہر ہیں لیکن اپنے موضوع کی رعایت سے اس مجلس میں ہم ایک دو پہلوؤں تک محدود رہیں گے۔

ہم اگر خود کو دھوکا نہ دینا چاہیں تو یہ بات ہم پر پوری طرح ظاہر ہے، واضح ہے کہ ہمارے مجموعی مزاج کی تشکیل میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ حتمی کردار کہیں نظر نہیں آتا جس سے خالی رہ کر اسلام اور بندگی کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔ نہ ہم نے کبھی اپنے ذہن کو بنانے کے لیے قرآن کو سیکھا سکھایا ہے، نہ کبھی اپنے اخلاق، دل اور طبیعت کی تعمیر کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو اپنا امام بنایا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی طاقتیں یہی دو ہوتی ہیں کہ اس کا ذہن کتنے بڑے خیالات اور علوم پیدا کر سکتا ہے اور اس کا مزاج، اس کا اخلاق کتنی بڑی معاشرت اور انسانیت کو جنم دے سکتا ہے۔ علم ضروری ہے دنیا کو سنوارنے کے لیے، اخلاق ضروری ہے انسانیت کو بنانے کے لیے۔ یہ دو انتہائی بنیادی چیزیں ہم نے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخذ نہیں کیں۔ یہ بات کسی آدمی کی رائے اور قیاس وغیرہ کی نہیں ہے۔ ہمارا دین ہم پر واجب کرتا ہے کہ ہم اپنی بہترین صلاحیتوں کو اس سے اخذ کریں۔ اپنے ذہن کو قرآنی ورلڈ ویو پر رکھیں، اور اپنی طبیعت کو اُس اخلاقی گداز پر قائم کریں جس کا بہترین نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت مبارکہ اور اخلاق مطہرہ ہیں۔ اس کو نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ذہن اور طبیعت کی پسماندگی اور کمتری کی وجہ سے غیروں کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم اللہ سے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، اسلام سے علانیہ اظہارِ بیزاری کرنے والوں کے دست نگر اور محتاج اور فقیر بن کے رہ گئے ہیں۔ کوئی اسلامی ملک، کوئی اسلامی ریاست، کوئی اسلامی معاشرہ ایسا نہیں ہے جو تعلیم سے لے کر دفاع تک، معیشت سے لے کر دواؤں تک دوسروں کا

محتاج نہ ہو۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے دنیا کو کھنگالنے والے، دنیا پر غالب آنے والے ذہن کی تعمیر کتاب اللہ سے نہیں کی، اور انسانوں کے لیے پُرکشش ماڈل بننے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنا کر کوئی کردار پیدا نہیں کیا۔ نہ ہم کوئی مکمل آدمی بنانے میں کامیاب ہیں، نہ پورا عالم اسلام کوئی مثالی معاشرہ بنانے میں کامیاب ہے اور نہ کوئی مثالی ریاست بنانے میں ہم بارہ سو سال سے کامیاب ہیں۔ اور زوال کسے کہتے ہیں! تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک productive individual، ایک مثالی فرد نہ تیار کر سکو، تم دنیا کے سماجی نظام میں کوئی نمونہ بننے کے لائق معاشرہ نہ بنا سکو، تم کوئی قانونی نظام نہ دے سکو، تم کوئی معاشی نظریہ نہ دے سکو، تم کوئی ریاستی آرڈر نہ دے سکو، تم اپنے دین پر قائم ہو جانے والی کوئی ریاست نہ بنا سکو، اور زوال کسے کہتے ہیں! اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے وفائی کا مکمل ترین مظاہرہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے! میں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے اندر سے بھی، نعوذ باللہ، نکال رکھا ہے، اپنی معاشرت سے بھی خارج کر رکھا ہے، اپنے نظام پر بھی بے اثر کر رکھا ہے، مزید کسی جگہ تو میں موجود ہی نہیں ہوں۔ میں وہ بدنصیب ہوں کہ جہاں جہاں ہوں، وہاں وہاں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فراموش رکھتا ہوں اور فراموش کروانے کا سامان رکھتا ہوں اور پھر اوپر سے دعوے کرتا ہوں کہ فلاں نظام لاؤں گا، فلاں قانون بناؤں گا، فلاں آئین بناؤں گا۔ الفاظ کی سختی اور لہجے کی درشتی پر معافی چاہتا ہوں لیکن کیا کیا جائے، ہم جس بگاڑ میں دیدہ دانستہ مبتلا ہیں اُس سے نکلنے کا پہلا قدم ہی یہ ہوگا کہ ہم خود پر ملامت کریں، سختی کے ساتھ، مضبوطی کے ساتھ۔ اپنی موجودہ حالت سے نفرت کیے بغیر ہم اُن اقدار سے مناسبت نہیں پیدا کر سکتے جن پر اللہ ہمیں ثابت قدم دیکھنا چاہتا ہے، صادق الاحوالی کے ساتھ، خلاق ذہن کے ساتھ، مجاہدانہ طبیعت کے ساتھ! سچی بات ہے کہ ہم خود سے پیچھا چھڑائے بغیر خود کو کبھی نہیں پا سکتے۔ ہم نے انسانی شخصیت کے اسفل حصے کو پوری آمادگی

کے ساتھ قبول کر کے اُسے اپنا مکمل تشخص بنا رکھا ہے۔ یہ ہمیں گھٹیا پن اور بے اصولی کی ایسی دلدل میں دھنسا رہا ہے جو قیام کے قابل چھوڑتی ہے نہ سجدے کے لائق رکھتی ہے۔ اس میں دھنسنے والے کی سانس جاری رہتی ہے اور اُس کی بندگی کا دم گھٹ جاتا ہے۔ ہم بے وفائی کی لپیٹ میں خود آئے ہیں، کسی نے ہمیں اس میں دھکیلا تھوڑی ہے۔ ہم نے اسے اپنا طرزِ زندگی بنایا ہے، اپنا طرزِ معاشرت بنایا ہے، اپنا طرزِ تربیت بنایا ہے۔ ہم اپنی اولاد کو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوری طرح بچاتے ہیں آپ میں سے کتنوں کے گھروں میں میٹرک کے طالب علم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے بڑے بڑے واقعات یاد ہیں؟ کسی لڑکے سے میں پوچھوں کہ احد پہلے ہوئی تھی یا خندق پہلے ہوئی تھی، تو وہ گڑ بڑا جائے گا۔ آپ حساب اور انگریزی پڑھانے کے لئے تیس چالیس ہزار روپے کا آدمی ڈھونڈتے ہیں اور قرآن پڑھانے کے لئے پانچ سو روپے کے بیچارے مفلوک الحال قاری صاحب، جو آپ کا عیش و آرام دیکھ کر پہلے ہی آپ کی بندگی میں جا چکے ہیں۔ کوئی آدمی ایسا ہے جس نے اپنے بچے کے لیے معلم قرآن ڈھونڈنے میں اتنی تگ ودو کی ہو جتنا اسے حساب اور کیمسٹری پڑھوانے کے لیے کی؟

قرآن یہ ورلڈ ویو دیتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کے لیے مدد فراہم کرتے رہو۔ آپس میں ایک دوسرے کو دینی، دنیاوی کسی بھی اعتبار سے گرنے نہ دو۔ آپس میں شفقت اور خیر خواہی پر مبنی معاشرت پیدا کر کے حق کا جھنڈا اٹھالو تو تم ہی غالب رہو گے۔ جو لوگ اللہ کے نام پر، محبت کی بنیاد پر، ایک نظام اخوت بنا لیتے ہیں، وہی پھر اللہ کی طرف دعوت کو کفر کی شکست کا سبب بناتے ہیں۔ ترتیب یہ ہے، کہ اپنے میں مواخات پیدا کرو، اس کے بعد ظلم اور ضلالت کے تمام ستونوں کو گرادینے والی قوت تمہیں خود بخود حاصل ہو جائے گی۔ ہم نے اس ترتیب کو الٹ رکھا ہے۔ الٹ کہاں رکھا ہے، کوئی ایک جز بھی اختیار نہیں کیا ہوا۔ ہمارے یہاں حق کا غلبہ ایڈونچرازم ہے اور

آپس میں خیر خواہی ایک تحزب کے تحت ہے، اور وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہے جیسی سٹاک ایکسچینج کے کارکنوں میں ہوتی ہے۔ وہ انسانی محبت تھوڑی ہے! انسانی محبت ہوتو میرا باپ بیمار ہے، مجھے تم تبلیغ کے لئے نکالنے کیوں آئے ہو! انسانی محبت ہوگی تو یہ فکریں بھی ساتھ ہوں گی ناں! مجھے چار مہینے سے نوکری نہیں ملی، تم مجھے مسلسل سامع بنائے ہوئے ہو ایک ایسے نصاب کا جو میرے کسی کام نہیں آرہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرورت کو دیکھتے تھے، ضرورت کے درجے کو نہیں دیکھا کرتے تھے۔ ایک ضرورت ہے مجھے پنکھے کی، دوسری ضرورت ہے مجھے جنت میں محل کی۔ اب ظاہر ہے دونوں ضرورتیں ہیں۔ کوئی آدمی کہے کہ چھوڑو پنکھے کو، بس جنت کا راستا ٹھیک ہے اور وہ میں تمہیں بتا رہا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔ یہ کون ہے، یہ آدمی تو آدمی کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرورت کی شدت کو بھی دیکھتے تھے، صرف فضیلت کو نہیں دیکھتے تھے۔ بھوک لگی ہے تو جماعت چھوڑ دو، بچے کے رونے کی آواز آئے تو نماز مختصر کر دو، یہ معاشرت کہاں ہے۔ یہی وہ معاشرت ہے جو دوسرے کو گرنے نہیں دیتی، نہ دنیاوی اعتبار سے، نہ اخلاقی اعتبار سے، نہ دینی اعتبار سے۔ اور ایک دوسرے کو گرنے نہ دینے والی قوت کو ہمارے ہاں مواخات کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اور آپ بھائی بن کر ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے تو اس حفاظت میں شدت اور تاثیر زیادہ ہوگی کرائے کے فوجیوں کی طرح ملک کی سرحد بچانے والوں کے مقابلے میں، تنخواہ دار mercenaries کے مقابلے میں۔ اب ہمارے سارے ادارے فنا ہو چکے ہیں اور خاندان کا ادارہ فنا ہونے پر تلا ہوا ہے۔

جو میں کہنا چاہ رہا تھا وہ یہ ہے کہ آج سے خدا کے لئے یہ شروع کرو کہ بچے کا مادّہ علم، بچے کے دماغ میں حرکت کا نظام قرآن سے مانوس کر کے بناؤ۔ قرآن میں بیان شدہ کائنات کو پرنیکس اور آئن سٹائن کی کائنات سے بہت بڑی ہے۔ اس سے سائنسی ذہن کی تسکین بھی زیادہ ہو جائے گی۔ قرآن میں بتائی ہوئی ہر بات انسانی دنیا اور انسانی

ادراک سے نکلی ہوئی سب باتوں سے سائز میں بھی بہت بڑی ہے۔تم یہ نہ سمجھو کہ بچے کے سر پر قرآن رکھ دینے سے یہ کند ذہن مولویوں کی طرح بنے گا۔ مولوی کند ذہن اس لئے ہے کہ اس نے قرآن کو کفیلِ شعور اور کفیلِ وجود نہیں بنایا۔ بچے کی ذہنی دنیا اور سوچنے سمجھنے کا انداز، تین برس کی عمر سے قرآن کے سائے میں رکھ کر بناؤ۔ تا کہ گیارہ بارہ، چودہ برس کی عمر تک آتے آتے تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ قرآن کے معارف، قرآن کے قرب، قرآن کے ورلڈ ویو سے بننے والا ذہن عام لوگوں کے مقابلے میں کتنا بالاتر ہوتا ہے، کتنا مکمل ہوتا ہے، کتنا یقین پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اور کتنا خودرائی سے پاک ہوتا ہے۔ اور یہی عمر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی اولاد کا ایسا محبوب بناؤ کہ وہ کہہ سکیں "بابا! آپ بھی کچھ نہیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے آگے"۔ تم سوچو ناں! بندگی کس چیز کا نام ہے؟ ذہن خدا کے مرکز کے گرد گھومے، قلب اللہ کو محبوب بنا کر عاشقوں کی طرح اس کی طرف لپکتا رہے۔ بچے تو بعد میں آتے ہیں پہلے اپنے آپ کو تو ادھر لائیں۔ آج سے تہیہ کر لیں کہ قرآن شریف کو اپنے دماغ کی، اپنے علم کی سب سے قیمتی بلکہ واحد متاع بنانا ہے، تنہا بنیاد بنانا ہے۔ آج سے طے کر لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا واحد جوہر بنانا ہے۔ کیا جاتا ہے! تم اللہ کے سپرد ہو رہے ہو، کسی اناڑی ماسٹر کے پاس تھوڑی جا رہے ہو جو کہتا ہے کہ سات برس سے پہلے یہ کورس پڑھایا ہی نہیں جا سکتا۔

قرآن شریف کی تلاوت سے گھر گونجنا چاہیے۔ وہ گھر مقبرہ ہے اور مقبرہ بھی فرعون کا ہے، جہاں قرآن کی آواز نہیں گونجتی۔ روز سب بچوں کے ساتھ سیرت کی نشست کیا کریں۔ اہتمام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت واقعات کی شکل میں پڑھیں۔ ایک دن پڑھیں، دوسرے دن بچوں کا امتحان لیں۔ امتحان حافظے کا بھی لیں اور عمل کا بھی لیں۔ بچے پر کبھی کمپرومائز نہ کیجیے گا۔ اس میں حیا ہونی بہت ضروری ہے، بڑوں کا ادب ہونا

بہت ضروری ہے، سچ بولنا بہت ضروری ہے اور سخاوت بہت ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اقدس سے مانوس ہونے کے ساتھ ہی حاصل ہونے والے جو سب سے پہلے نتائج ہیں، وہ یہی ہوتے ہیں۔ تمہارا بچہ حیادار بن جائے گا، سخی بن جائے گا، سچا بن جائے گا، بڑوں کا ادب کرنے والا بن جائے گا۔ اور حیا کو خاص طور پر اہمیت دیجیے گا۔ بخل پیدا ہو جائے تو وہ چھوڑا جا سکتا ہے، بڑوں سے تھوڑا بہت اونچ نیچ ہو جائے تو شرمندہ ہوا جا سکتا ہے، کوئی ایک آدھ جھوٹ بول دیا جائے تو اس سے بھی نجات پائی جا سکتی ہے لیکن بے حیائی پیدا ہو جائے تو اس کا علاج بہت مشکل ہے۔ بے حیائی تمام گناہوں کی ماں ہے۔ بے حیائی کہتے کسے ہیں؟ نہ اللہ سے شرمانا نہ بندے سے شرمانا۔ جس سے اللہ کی شرم اٹھ جائے اسے کیا فکر کہ وہ اللہ کے دین پر چلے۔ حیا بہت ضروری ہے، اور اس میں لڑکی لڑکے میں تمیز نہ کریں۔ یہ جاہلیت ہے کہ لڑکی بے پردہ نکلی تو طوفان مچ گیا اور لڑکا رسالے میں ایکٹریس کی تصویر دیکھ رہا ہے تو اسے کوئی نہیں ٹوکے گا۔ یہ دین دار لوگوں کا نظامِ تربیت بتا رہا ہوں آپ کو! اس طرح کی مجلسیں بنائیں، اس طرح کے لوگ ڈھونڈیں جو قرآن شریف کے ساتھ اسلاف کے طریقے پر مناسبت پیدا کریں۔ جس طرح ہمارے سلف قرآن شریف سے تعلق رکھتے تھے، اس طرز تعلق پر کوئی شخص اگر آپ کو، مجھے قرآن شریف سے نزدیک آنے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے تو وہ ہمارا سب سے بڑا مرشد ہے، وہ ہمارا سب سے بڑا استاد ہے، وہ ہمارا سب سے بڑا محسن ہے۔ لیکن جدید آدمیوں کی طرح نہیں، ان کا مقصود محض ریسرچ ہے۔ اللہ نے ہمیں اس وقت جس امتحان میں ڈالا ہے، وہ یہ ہے کہ ''یہ یا ہم؟'' یہ یاد رکھنا ہم سخت امتحان کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں اور اس وقت اللہ سوال یہ کر رہا ہے کہ یہ یا ہم؟ اس میں اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا، اور کوئی ڈھیل نہیں ملے گی، اب صاف جواب دینا ہے۔ اور جواب کیا دینا ہے، اُس کو کون جواب دے گا؟ صاف صاف عرض کرنا ہے کہ یا اللہ آپ کے سوا کو

ن ہے میرا! یہ عمل سے، جذبے سے، ذہن سے سب سے ثابت کرنا ہے، ورنہ ڈھونڈتے رہو گے کہ میزائل بنالیں گے تو ترقی کرلیں گے، جی ڈی پی بڑھالیں گے تو زوال سے بچ جائیں گے۔

سکندرِ اعظم کی سلطنت اس کے آخری سانس کے ساتھ ٹوٹ گئی تھی کہ اللہ بڑے سے بڑے اسٹرکچر کو اس طرح ڈھا دیتا ہے۔ کسی وہم میں نہ رہنا کہ میرا گھر ادھورا رہ جائے گا، میرا کاروبار متاثر ہوگا۔ ارے کاروبار کیا، وہ ساری دنیا کو ایک لمحے میں غارت کرسکتا ہے۔ اللہ کو مشتعل کردینے والا بہانہ نہ بناؤ۔ ہاں یہ کہو یا اللہ! کمزور ہوں، یا اللہ! رحم فرما، یا اللہ! کمزور ہوں بہانے نہیں بنارہا، نافرمانی نہیں کررہا، یا اللہ! طاقت بھی دے دیجئے، کمزوریاں معاف کردیجیے، بے وفا نہیں ہوں، نافرمان نہیں ہوں، باغی نہیں ہوں!

اخلاق، علم اور طاقت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ

تین چار باتیں کرنی ہیں، اس لیے آج کی گفتگو منتشر ٹکڑوں کی شکل میں ہوگی۔ نیکی کے بارے میں تصور یہ ہونا چاہیے کہ اگر طبعی ہے تو اللہ کی توفیق سے ہے، اختیاری اور اکتسابی ہے تو اللہ کے حکم سے ہے۔ اور ہر نیکی، ہر طرح کی نیکی اللہ کی خوشنودی تک پہنچنے کے لیے ہے۔ نیکی اس درجے کو پہنچ جائے تو ذہن میں بڑے بڑے اخلاقی تصوّرات بننے لگتے ہیں اور تمام چیزوں میں گہرائی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بڑے تصوّر اور بڑے آئیڈیل کے بغیر اخلاق بس اچھّی عادتیں ہیں جو شخصیت کی تعمیر اور ایک محدود معاشرت کی تشکیل میں یقیناً مفید ہیں لیکن آج کی دُنیا میں ہماری بقا کو جو طرح طرح کے چیلنج درپیش ہیں، اُن کا سامنا محض اچھّی عادتوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے اور باتوں کے علاوہ ہمیں اپنے اخلاقی آئیڈیلز کو پھر سے دریافت کر کے ذہن میں اُن کی فعاّل اور خلاّق مرکزیت کو بحال کرنا ہوگا۔

اس کی ذرا سی تفصیل ہے۔ حق، خیر اور جمال پر کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے۔ یہ وجود کے بھی اصول ہیں اور شعور کے بھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ تین اصول، زندگی کی بنیادی

قدریں ہیں اور ذہن کے مستقل تناظر۔ اخلاقی شعور، خیر کے آئیڈیا (Idea) سے بنتا ہے اور اسی سے تمام اخلاقی تصوّرات جنم لیتے ہیں۔ لیکن خیر، حق اور جمال سے لاتعلق نہیں ہے بلکہ یہ تینوں اصول ایک دوسرے سے ممتاز رہتے ہوئے بھی آپس میں مربوط اور ہم مقصد ہیں۔ ان کا باہمی تعلق ایسا ہے کہ تینوں میں ہر ایک باقی دو سے جُڑ کر ہی حقیقی اور بامعنی ہے۔ اسی لیے اخلاقی مسلّمات کی تفصیل وتشریح اور تصوّرات کی تشکیل میں شعور کی دیگر قوتیں بھی شریک رہتی ہیں۔ مثلاً اخلاقی اصول کو عقل کے لیے بھی لائق تسلیم ہونا چاہیے اور خود عقل کو اپنی بنیادی سرگرمی میں خیر کے اخلاقی اصول سے ہم آہنگ رہنا ضروری ہے۔ آپ سمجھ گئے ناں کہ اخلاق کا علمی، احوالی اور عملی مادّہ کمزور ہو تو اس کے مظاہر سطحی، رسمی، بے تاثیر اور بے کشش ہو کر رہ جاتے ہیں اور ذہن سے لے کر احساسات، اور احساسات سے لے کر ارادے تک اخلاقی شعور کا عمل دخل کم سے کم ہوتا جاتا ہے اور زندگی میں اس کا کوئی نتیجہ خیز کردار باقی نہیں رہتا۔ زندگی کے حقیقی اور بنیادی محرّکات کی فہرست میں اخلاقی محرّکات کے لیے جگہ نہیں بچتی۔ اس بات کو ذرا واضح کرنے کے لیے قدرے تمثیلی رنگ میں عرض کرتا ہوں۔ ہر خیال، حال اور عمل ایک بیان کی طرح ہوتا ہے جس کی تصدیق اور توثیق کے لیے ضروری ہے کہ اس پر چار مہریں لگی ہوئی ہوں۔ دین کی مُہر، اخلاق کی مُہر، عقل کی مُہر اور جمالیاتی شعور کی مُہر۔ اس اصول پر دیکھیں تو اخلاق کو بھی دین، عقل اور جمالیات کی تصدیق درکار ہے۔ اخلاق کو اگر ایک جیتا جاگتا وجود فرض کر لیں تو دین اس کی روح ہے، عقل اس کا ذہن اور جمالیات اُس کا جسم۔ ان میں سے ایک چیز بھی اگر غائب یا کمزور ہے تو اسی حساب سے وہ وجود بھی ناقص ہے۔ اب ہمیں دیانت داری سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہمارا اخلاقی وجود پوری طرح زندہ ہے یا بیمار ہے یا حالتِ نزع میں ہے؟ مجھے تو، سچی بات ہے، یوں لگتا ہے کہ یہ وجود روح سے عاری ہے، اس کا ذہن ماؤف ہے اور جسم بے ڈول۔ لیکن آپ بھی

دیکھیں۔ ممکن ہے آپ کی آنکھیں کوئی اچھا منظر تراش لیں۔

اجتماعیت کی تشکیل کا عمل اخلاقی اصول پر ہوتا ہے۔ یہ اخلاقی شعور ہی ہے جو فرد کو باور کرواتا ہے کہ وہ اجتماعی وجود بھی ہے۔ اخلاقی اصول اور اقدار اگر صرف چند انفرادی رویّوں اور طرزِ عمل تک محدود ہوجائیں اور معاشرت میں اُن کا کوئی مؤثر کردار نہ رہ جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اجتماعیت کو اس کی مسلّمہ بنیادوں پر قائم کرنے یا رکھنے والی قوّتیں بہت کمزور پڑ گئی ہیں۔ یعنی ریاست یا حکومت اور سوسائٹی کے ادارے اپنی بنیادی ترین ذمہ داری ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اس صورتِ حال میں سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ بہت یاد آتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اصول تھا جو ان کے بہت بحرانی فیصلوں میں ظاہر ہوا کہ دین کے مطلوب پہ نظر گاڑے رکھو، اور اس مطلوب کو پورا کرنے کی صورتیں اگر کہیں بدلنی پڑیں تو بدل ڈالو۔ دین کا آئیڈیل کسی ایک عملی صورت کا اسیر نہیں ہے۔ اس میں ایک ایسی کلیت ہے جو کسی مخصوص صورت میں محبوس اور محصور ہو جانے کی بجائے تعمیل کی ہیئتیں خود پیدا کرتی رہتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا جو اصل کارنامہ ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے تہذیبی، قانونی اور سماجی اسٹرکچر کو بڑے بڑے زلزلوں سے بھی ہلنے نہیں دیا اور انسان کی بدلتی ہوئی دنیا میں اس عمارت کو اپنے قدم جمائے رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی، وہ بھی فراہم کیں۔ یہ کارنامہ غیرِ انبیا کی تاریخ میں، کسی بھی شخصیت نے اپنی دینی روایت کے تحفظ اور توسیع کے لیے، کبھی سرانجام نہیں دیا۔

اب ہم جس صورت حال میں گھرے ہیں، اس میں واحد علاج کے طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اسی بصیرت کی ضرورت ہے۔ یعنی انسانوں میں عمل اور خیالات کی جتنی بھی قسمیں ہیں، ان سب کو ایک ہی حکمت سے چلانا کیونکہ جو دانائی قرآن سمجھنے میں درکار ہے، وہی دنیا کی تعمیر میں درکار ہے۔ یعنی دنیا کے سارے علوم اللہ کی معرفت سے پیدا ہوں اور اللہ کی معرفت کی فراہمی پہ تمام ہوں۔ دنیا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی انفسی اور آفاقی

گرفت کے چھوٹنے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اس حدیث مبارکہ کا مصداق بنے ہوئے ہیں کہ ایک وقت آئے گا کہ کفار تم سے کھیلیں گے۔ اگر ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منہجِ حکمت کی وراثت کا حق ادا کرنے کے لائق رہتے، اور آنجناب کی بے مثل بصیرت اور فراست کی پیروی کرنے کے قابل ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ اٹل قانون اور متغیر حالات کے درمیان تعلق کو زندہ اور موثر حالت میں تسلسل اور تنوع کے ساتھ برقرار رکھنے کی فاروقی روایت شریعت، فہمِ شریعت اور تعمیلِ شریعت کے لمبے سفر میں جیسی محفوظ اور حتمی رہنمائی کر سکتی ہے، ہم نے اُس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ صوفیانہ طرز پر عرض کرتا ہوں کہ سب سے بڑا مرتبہ، سب سے اونچا درجۂ قرب حضورِ الٰہی ہے۔ یہ حضور، یعنی گویا اللہ کو دیکھنے کے نتیجے میں میسر آنے والی یکسوئی، بندے کے باطن میں بھی ہوتا ہے، یعنی انفسی بھی ہوتا ہے، اور خارج میں بھی ہوتا ہے، یعنی آفاقی بھی ہوتا ہے۔ اِن دونوں مقاماتِ حضور میں آفاقی حضور زیادہ کامل ہے، کیونکہ انفسی حضور میں تخیل کی آمیزش ممکن ہے۔ اللہ کی نشانیوں کو اپنے باہر دیکھنا، ایک تو محض خیال نہیں ہو سکتا اور دوسرے اِس حضور میں یہ احساس بھی شاملِ حال رہتا ہے کہ میں بھی بلکہ ساری کائنات بھی اللہ کی نظر میں ہے۔ اس طرح اللہ کی نظر میں ہونے کا یقین اللہ کو دیکھنے کے اعتبار میں ایک احوالی حالت اور دوامِ یکسوئی پیدا کر دیتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس حضورِ آفاقی کے امام ہیں اور یہی وارثِ رسالت کی شان ہوتی ہے۔ وہ تعلق باللہ کے سب احوال کو باہر کی دنیا میں بھی نتیجہ خیز بنا دیتا ہے جیسا کہ اپنے دورِ خلافت میں امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے کر کے دکھایا۔

محیطِ ختمِ رسالت ترے گھر پہ سلام
عمر رضی اللہ عنہ پہ سلام

اللہ کے لیے وقت نکالیں۔ موجودہ دور کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ مصروفیت کا

ہے۔ ایک زمانے میں شیطان کاہلی سکھاتا تھا، اب مصروفیت کی تعلیم دیتا ہے۔ اب ہر آدمی بہت مصروف ہے، اور وہ اپنے آپ کو مصروف کہنے میں جھوٹا نہیں ہے۔ موجودہ دروبست سے نکال کر دیکھا جائے تو بھائی، مصروفیت کوئی بری چیز نہیں ہے۔ مصروف آدمی وقت کے ساتھ ایک نتیجہ خیز تخلیقی اور اخلاقی ہم آہنگی اور ہم قدمی پیدا کرلیتا ہے۔ وہ اپنے امکانات کو عمل میں ڈھالنے اور ان کی تاثیر کو نفس سے دُنیا تک توسیع دینے کا کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مصروفیت میں یہ برکت بھی ہے کہ مصروف آدمی خود اپنے آپ سے بار بار آزاد ہوتے رہنے کے تجربے سے گزرتا رہتا ہے۔ اتنی بڑی اور ایسی مسلسل آزادی بھلا کسی کو دُنیا اور خواہشات کی رسّیوں سے بنے ہوئے جال میں کیسے پھنسنے دے گی؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ اللہ سے وقت بچانا بخل ہے، بے حمیتی ہے! وقت کے بارے میں اپنے تصور کو بدلیے۔ رائج الوقت تصور یہ ہے کہ وقت کو کام میں لاکر ہم اپنی دنیا اچھی بنا سکتے ہیں اور اسے ضائع کر دیا تو ہماری دنیا میں خرابی اور بدحالی داخل ہو جائے گی۔ یعنی وقت کا سارا مصرف اخروی مفادات سے لاتعلق ہو کر محض دنیاوی ہو چکا ہے۔ ہماری دنیا طلبی اور خودغرضی نے ہمیں تو پستی میں دھکیل ہی دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وقت کو بھی گراوٹ کی انتہا پر پھینک دیا۔ وقت انسان سے زیادہ پھیلاؤ رکھتا ہے، اس کا کائناتی شکوہ اتنا تہ دار اور جامع المراتب ہے کہ وہم بھی اُس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اللہ کے نظامِ قدرت کی اس سب سے طاقت ور اور ہمہ گیر نشانی کو ہم نے اپنے گھٹیا پن کی نظر کر دیا، گویا بُراق پر خچر کی لگام کس دی۔ وقت کے بارے میں صحیح تصور یہ ہے کہ یہ ایک حال سے دوسرے حال تک پہنچاتا ہے اور اِس کی حرکت کا رخ خلق سے حق کی طرف ہے، ابدیت کی جانب ہے اور آخرت کے رخ پر ہے۔ اسے محض دنیا اور دنیاوی زندگی تک محدود کر دوگے تو ممکن ہے کہ تمہاری دنیا تو تمہارے تصور کے مطابق آرام دہ ہو جائے لیکن یاد رکھنا یہ آرام اللہ سے دوری، ابدی خسارے اور اخروی اذیت کو تمہاری نظر سے اوجھل

رکھنے والا ایک رنگین پردہ ہے، اور کچھ نہیں۔ تصوف میں 'وقت' ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے وہ باطنی حال جو یا تو اللہ کے قرب سے پیدا ہوا ہے یا دوری سے۔ اس معنی پر ذرا غور کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں زمانِ انسانی کی پوری حقیقت بیان ہو گئی ہے۔ کیا ہمیں نہیں لگتا کہ وقت اپنے ہر ہر لمحے میں محض ایک حرکت ہے جو اللہ کے قرب کا راستہ بھی طے کروا سکتی ہے اور اُس سے دوری کے پاتال میں بھی لے جا سکتی ہے۔ تو بھائی وقت کی قدر کرو اور اسے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بناؤ اور اپنی اس واحد سواری کا رخ غلط نہ ہونے دو ورنہ یاد رکھنا کہ اس گھوڑے کے سم جہنم کی آگ سے بھی نہیں پگھلتے اور یہ اپنے سوار کو ہاویہ تک بھی لے جا سکتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ اپنے وقت کو اپنی دنیا کے لیے مفید نہ بناؤ۔ ضرور بناؤ مگر اخروی مفاد کو دنیاوی فائدوں پر حتمی ترجیح دینے کی عادت ڈالو۔ دنیا اللہ کی نعمتوں کا ایک گھر ہے، ان نعمتوں سے فیض یاب ہونے کی کوشش نہ کرنا یقیناً ناشکری ہے۔ شکر گزار دل کے ساتھ جسم کو راحت پہنچاؤ تا کہ جنت کی کشش میں اور اضافہ ہو جائے۔ وہ دنیاوی فلاح بہت مبارک ہے جو اخروی فلاح کا مشتاق بنا دے، جنت کی طلب بڑھا دے اور اللہ سے ملاقات کی تمنا کو تمام خواہشات پر غالب کر دے۔ ان شاء اللہ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے بس وقت کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کرنا سیکھ لو۔ وقت کا درست مصرف دنیا میں نعمتوں کے دائرے میں رکھے گا اور آخرت میں منعم کے حضور میں۔ تو مختصر یہ کہ روز کچھ وقت نکالا کریں اچھی تنہائی کے لیے اور اچھی مجلس کے لیے۔

اس وقت حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ مغرب واحد تہذیبی معیار بنتا جا رہا ہے۔ اس کو چاہے مجبوری کا نام دے دیجیے لیکن صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے کہ اب جو موضوع بھی مغرب کے مقابلے میں تیاری کے لیے مفید نہیں، وہ بے کار ہے۔ ہمیں اپنی اخلاقی اقدار کا احیا، یعنی خلاقی کے ساتھ احیا کرنا ہے، علمی سربلندی کا سامان کرنا ہے اور قوت

حاصل کرنی ہے۔ انہی تین بنیادوں پر تہذیبوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ ہم نے ان تین ستونوں کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے، درست ترتیب کے ساتھ۔ اور وہ درست ترتیب یہ ہوگی کہ اب پہلا ستون اخلاق کا بنے گا، دوسرا ستون علم کا بنے گا، تیسرا ستون قوت کا بنے گا۔ اب جس نے بھی ان تینوں سے غفلت برتی، وہ امت کا حصہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ اپنے اخلاق کو بانجھ نہ ہونے دو، علم کو خیالی اور قیاسی نہ رہنے دو، اسے خوابنا کی کی دھند میں نہ چھوڑ دو اور طاقت کو اخلاق اور علم کے محافظ کے طور پر حاصل کر کے محفوظ رکھو۔ کیونکہ دنیا کا ہر علم اپنے پھیلاؤ میں طاقت کا محتاج ہے۔ ہمیں اپنی بقا اور اصولی ترقی کے لیے انسان اور تہذیب کے بارے میں ذرا گہرائی کے ساتھ جاننا چاہیے کہ انسانی نفس کی ساخت کیا ہے اور تہذیب کی بناوٹ کیسی ہوتی ہے۔ نفسِ انسانی اور تہذیب کا ایک فطری نظامِ تشکیل ہے جس سے غافل رہ کر یا جسے نظر انداز کر کے ہم اپنے دین کے مطلوبہ آدمی اور مطلوبہ تہذیب کا نہ صرف یہ کہ شعور نہیں حاصل کر سکتے بلکہ موجودہ حالات میں دینی آدمی اور دینی تہذیب کے قیام کی کوئی مؤثر اور قابلِ عمل کوشش بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری موجودہ حالت یہ ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں اُسے یا تو محض ایک نعرہ بنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں یا پھر اُن خواہشات کو ناقابلِ عمل رومانویت کی دھند میں جھونک دیتے ہیں۔ ہمیں یہ شعور اور احساس پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ اپنے دین کے مطلوبہ آدمی کو اُس کی انفرادی اور اجتماعی تفصیلات کے ساتھ پہلے تو ٹھیک سے سمجھیں اور پھر قطعاً ناموافق حالات میں اُس کے لیے کم از کم اتنی جگہ نکالنے کی علمی اور عملی تدابیر کریں کہ دنیا کو یہ دکھایا جا سکے کہ اسلام کا تصورِ انسان اور تصورِ زندگی عملی صورت میں اس طرح کا ہوتا ہے۔ ہم یہ باتیں کوئی تحریک چلانے کی نیت سے نہیں بلکہ شعور کی بیداری اور احساس کی زندگی کے لیے کر رہے ہیں۔ اخلاق، علم اور طاقت کے وہ ستون جن پر کسی بھی تہذیب کا اسٹرکچر کھڑا ہوتا ہے، ہمیں بھی بنانے ہیں مگر اس سامانِ تعمیر کے ساتھ جو ہمارا دین ہمیں فراہم کرتا ہے۔

ایک بار تہذیب کی تعمیر و تشکیل کا قانونِ قدرت سمجھ میں آجائے تو پھر اُس قوت کی پیدائش کا ٹھوس امکان جنم لیتا ہے جو ہمیں ہماری تہذیب کو عمل میں لانے کے لیے متوجہ اور تیار کر سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تہذیبیں محض وعظ و نصیحت اور بیان بازی سے نہیں بنتیں، تاہم ہمیں یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ تہذیبوں کی فنا بقا کا تاریخی اور تقدیری قانون کیا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ تہذیب کی یہ تین لازمی بنیادیں محض فرد، محض معاشرے اور محض ریاست سے تعمیر نہیں ہوسکتیں۔ اس تعمیر کے لیے ان تینوں کی مسلسل ہم کاری درکار ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ اصول بھی واضح ہے کہ ایک آئڈیا کے طور پر تہذیب اگر شعور کے مرکز میں اپنی صورت گری کر لے تو پھر اسے عمل میں لانے کا وہ راستہ کھلنے لگتا ہے جس میں فرد کی ذمہ داری بھی واضح ہو جاتی ہے اور سوسائٹی اور ریاست کا کام بھی طے پا جاتا ہے۔ تو ہم پہلے فرد کو مخاطب کر رہے ہیں تاکہ وہ تہذیبی شعور میسر آجائے جو تہذیبی وجود کی اساس بنتا ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم تہذیبی وجود تو بننے میں ناکام ہیں ہی، تہذیبی شعور بھی ہم سے اتنے فاصلے پر چلا گیا ہے کہ ہمارا ذہن کوئی مستقل تہذیبی موقف اور تناظر تشکیل دینے کا مزاج ہی نہیں رکھتا۔ تو سب سے پہلے ہمیں اپنے ذہن کے اس مزاج کو بدلنا ہے جو مغربی تعلیم کے اثر سے بنا ہے اور جس کی لپیٹ میں مذہبی ذہن بھی آگیا ہے۔ اب مذہبی ذہن کا بھی یہ حال ہے کہ وہ واقعی طغیانی کے آگے خیالی بند باندھنے میں مصروف ہے، اور اس مصروفیت کو اپنی دینی ذمہ داری اور اعلاء کلمۃ الحق کا نام دیتا ہے۔

اخلاق، علم اور قوت کا معاملہ یہ ہے کہ اخلاق اور اُس کے اقدار کی تعمیر و تجدید فرد اور پھر معاشرے کی ذمہ داری ہے، اس میں ریاست کی کمک بہت مفید ہے لیکن ضروری نہیں۔ علم کا اساسِ تہذیب بننا فرد، معاشرے اور ریاست تینوں کا مشترکہ فریضہ ہے۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارا بنیادی تصورِ علم جیسے نظامِ تعلیم کا تقاضا کرتا ہے اور اُس کی دنیاوی افادیت کی بھی ضمانت دیتا ہے، یہ ضمانت ریاست کی

شمولیت کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح طاقت جو علم اور اخلاق کی محافظ بھی ہے اور اپنی تعمیری صورت میں ان کے پھیلاؤ کا ذریعہ بھی ہے، اس کا حصول ریاست کے ذمے ہے معاشرے کی پوری تائید کے ساتھ۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ بات پوری طرح درست ہے کہ نظمِ ریاست میں اگر بگاڑ پیدا ہو جائے تو تہذیب بھی فساد کا شکار ہو کر رہتی ہے۔ صرف فرد اور معاشرے میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے تہذیبی اصول و اقدار کا ایک ایسے ماحول میں دفاع کر سکیں جو پوری طرح مخالفانہ ہے۔ اس لیے جو لوگ نظام کی تبدیلی کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں، وہ ہمارے تہذیبی احیا کے منصوبے میں ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ نظام بدلنے کی کوششیں اُس وقت تک غیر مؤثر ہیں جب تک ہم اخلاق اور علم کے ستونوں کی تعمیر کو بھی ویسے ہی اہمیت نہیں دیتے جیسی کہ قوت کی بازیافت کو دیتے ہیں۔ اس پہلو سے فرد کی تربیت اور معاشرے کی اصلاح کی کوششیں بھی اتنی ہی لازمی ہیں جتنی کہ تبدیلیِ نظام کی تحریک۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس سے بھی زیادہ ضروری! کیونکہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد غیر مسلم ریاستوں کی شہری ہے، اُن پر بھی واجب ہے کہ وہ اپنی انفرادیت اور اجتماعیت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں اور فرد اور معاشرت کی سطح پر علم اور اخلاق کی دینی بنیادوں پر خود کو استوار رکھیں۔ مسلم ریاست کے باسیوں کی حالت بھی غیر مسلم ریاست کے مسلمان شہریوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہاں ریاستی ڈھانچا اتنا مسخ ہو چکا ہے کہ اسے ٹھیک کرنے میں جو طویل وقت لگے گا، اُس کے انتظار میں فرد اور معاشرے کو اُس کی موجودہ حالت پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ہم ریاستی لاتعلقی کے باوجود ایک قابلِ اعتبار درجے پر اچھا آدمی اور اچھا معاشرہ بن کر دکھا سکتے ہیں۔ اس میں ناکامی کا یہ عذر کافی نہیں ہے کہ ہمارا نظامِ حکومت غیر اسلامی اور غیر انسانی ہے۔ تو بھائی حق پر رہنے کے لیے، خیر پر رہنے کے لیے اپنی ذمہ داری سے غفلت نہ برتو، اور ایک ابراہیمی یکسوئی

اور جذبے کے ساتھ کم از کم فرد اور معاشرے کو قبلہ رو کرنے کی مسلسل جدو جہد سے منہ نہ موڑو۔ اس طرح ریاست کی غفلت اور بے حمیتی کے باوجود معاشرے میں اتنی قوت ضرور پیدا ہو سکتی ہے جس سے ہم اپنا تہذیبی دفاع کر سکیں۔ طاقت صرف تلوار نہیں ہے جو ریاست کے ہاتھ میں ہوتی ہے، یہ ڈھال بھی ہے جو فرد اور معاشرے کی دسترس میں بھی ہوتی ہے۔ تو مختصر یہ کہ اخلاق حق کا دستر خوان ہے جس پر بیٹھنے کے لیے کافر و مومن کی تخصیص نہیں، علم حق کی روشنی ہے جس سے غیر مسلموں کے گھر بھی روشن ہوتے ہیں اور طاقت حق کی تلوار بھی ہے اور سپر بھی، جس سے مسلم ریاست اور معاشرت کے دائرے میں آنے والے ہر فرد کی حفاظت کی جاتی ہے۔
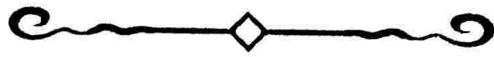
اجتماعیت کی تشکیل کا عمل اخلاقی اصول پر ہوتا ہے۔ یہ اخلاقی شعور ہی ہے جو فرد کو باور کرواتا ہے کہ وہ اجتماعی وجود بھی ہے۔ اخلاقی اصول اور اقدار اگر صرف چند انفرادی رویّوں اور طرزِ عمل تک محدود ہو جائیں اور معاشرت میں اُن کا کوئی مؤثر کردار نہ رہ جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اجتماعیت کو اس کی مسلّمہ بنیادوں پر قائم کرنے یا رکھنے والی قوتیں بہت کمزور پڑ گئی ہیں۔

(''اخلاق، علم اور طاقت'' میں سے)